انتظار حسین
گھاس کے میدانوں میں
(ناول)

گھاس کے میدانوں میں

(ناول)

تصنیف: انتون چیخوف

ترجمہ: اِنتظار حُسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

پیش لفظ

چیخوف کی یہ لمبی کہانی جسے مختصر ناول بھی کہا جا سکتا ہے، میں نے کہیں اپنے شروع میں پڑھی تھی اور بھول گیا تھا۔ انھیں دنوں روسی فکشن سے کچھ ٹکڑے نوالے لیے اور انھیں اُردو کا جامہ پہنایا۔ چیخوف کی بھی ڈھائی تین کہانیاں ترجمہ کیں، مگر ان سے تسکین نہیں ہوئی، جی چاہتا تھا کہ چیخوف کا جی بھر کر ترجمہ کیا جائے۔ مگر یہ خواہش جی کی جی ہی میں رہ گئی۔ میں اور سمتوں میں چل پڑا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

بیچ بیچ میں کئی دفعہ چیخوف سے رجوع کیا کہ دیکھیں وہ کہانیاں جنھوں نے شروع میں مجھ پہ جادو کیا تھا اب کیسی لگتی ہیں۔ اتفاق کہیے کہ ہر مرتبہ Steppe تک آتے آتے چیخوف سے رُخ کسی اور طرف مڑ گیا۔ یہ کہانی دوبارہ پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ پچھلے برس کی بات ہے کہ میں نے ایک مرتبہ پھر چیخوف کو ہاتھ لگایا اور اب کے کہانیاں پڑھتے پڑھتے اس کہانی کو چھو لیا۔ بس پکڑا گیا۔ تعجب کہ پہلے اس کہانی سے سرسری کیسے گذر گیا تھا۔ حیران کہ یہ کس زمین و آسمان کا ذکر ہے۔ چیل تو میری بستی کے آسمان پر بھی اسی طرح اڑتی تھی، اڑتے اڑتے اسی طرح ساکت ہو جاتی جیسے سو گئی ہو اور سوئی سوئی ہوا میں تیر رہی ہو۔ اسی طرح جھاڑیوں کے پاس سے میں گذرتے ہوئے کوئی پرندہ ہڑبڑا کر جھاڑی سے نکلتا اور پھڑپھڑاتا بلندیوں میں اُٹھتا چلا جاتا۔ اسی طرح ہوا بند ہو جاتی اور پھر اچانک بگولا

اُٹھتا اور پتنگوں کی ٹوٹی کمانیوں مرغی کے پروں بوسیدہ کاغذوں، جھاڑوں کے تنکوں چیتھڑوں گودڑوں کو سمیٹتا ناچتا اوپر کے رُخ اُٹھتا چلا جاتا۔ پتہ نہیں میرا تجربہ سرک کر چیخوف کے پاس کیسے پہنچ گیا۔

چیخوف نے لکھا ہے کہ جب وہ یہ کہانی لکھ رہا تھا تو اسے سٹیپی Steppe کی اور اس کے موسم گرما کی مہک آرہی تھی۔ ادھر کہانی پڑھتے اور ترجمہ کرتے ہوئے مجھے اپنی بستی کی گرمیوں کی لپٹیں آرہی تھیں۔ ان بیتے دنوں کی دوپہریں اور اُمستی راتیں مستقل میرے آس پاس منڈلاتی رہی ہیں۔ گذرے موسموں کے، درختوں کے، پرندوں کے احسانات ایک ایک کر کے یاد آئے۔ شرمندہ ہوتا رہا کہ کوئی بھی احسان اتار نہیں پایا۔ مگر موسموں درختوں اور پرندوں کے احسانات اتارنے کے لیے لکھنے والے کے پاس چیخوف کا قلم ہونا چاہیے۔

پکار تو مجھے بھی وہی آئی تھی جو چیخوف کو اپنے سٹیپی کے میدانوں سے آئی تھی۔

"جیسے سٹیپی کو اپنی تنہائی کا خیال ستا رہا ہو، جیسے اسے یہ پتہ چل گیا ہو کہ اس کے دامن میں بھری دولت سے دنیا کو کوئی فیض نہیں پہنچ رہا ہے، جیسے اس کا سارا فیضان ساری دولت رائگاں جا رہی ہے کہ نہ اس کے گیت گائے جاتے ہیں نہ کسی کے یہاں اس کی طلب ہے۔ اسی کیف و سرور کی ہماہمی میں یاس و افسردگی میں ڈوبی ایک پکار جیسے وہ دھرتی پکار رہی ہو کہ گیت گانے والو، اے گیت گانے والو...."

پکار بہرحال بے اثر نہیں رہی۔ چیخوف کی یہ کہانی اسی پکار کا اثر ہے۔ کہانی تھوڑا ہی ہے، گیت ہے۔ ایک بے رنگ بے وقعت زمین کا گیت۔ شاعر ان زمینوں کے گیت گاتے ہیں جہاں گل و گلزار پھولے ہوں، بادِ صبا اٹکھیلیاں کرتی چلتی ہو، طائرانِ خوش الحان نغمہ سرا ہوں۔ ایسی بے رنگ زمین جہاں دور تک گھاس اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا ہو اور پرندوں میں چیل اور کوّے سب سے نمایاں ہوں۔

انھیں کہاں بھاتی ہے، مگر چیخوف نرالا شاعر ہے۔ اسے بے رنگی ہی راس آتی ہے۔ اسی میں اسے رنگ نظر آتے ہیں۔ سٹیپی جیسی بے رنگ زمین کا گیت چیخوف ہی گا سکتا تھا، مگر بے رنگ تو وہ اس وقت تھی جب تک چیخوف نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ذرا غور کیجیے کہ جب یہ سفر کی کہانی شروع ہوئی ہے تو کیا بے رنگی کا سماں تھا۔ بادا آدم کے وقتوں کی ایک انجر پنجر ٹم ٹم تین سواریاں لادے کچے پکے راستوں پہ ٹخ ٹخ کرتی چلی جا رہی ہے۔ ان سواریوں میں ایک پادری صاحب ہیں۔ دوسرا ان کا ایک بیوپاری ہے۔ تیسرا اس کا کمسن بھانجا ایگوریشکا ہے جسے اس کی ماں نے بھائی کے ساتھ کر دیا ہے کہ شہر میں کسی سکول میں داخل کرا دو کہ پڑھ لکھ جائے اور شریفوں میں بیٹھنے کے قابل بنے۔ ٹم ٹم بستی سے نکلتی ہے اور اس رستے پر پڑ لیتی ہے، جہاں ارد گرد دور دور تک بس گھاس نظر آ رہی ہے یا جھاڑیاں یا کوئی اکا دکا مٹیالا ٹیلہ۔ ایک یکساں بے کیف منظر ہے جس میں تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، لیکن اسی بے رنگی میں سے دھیرے دھیرے رنگ پھوٹنے شروع ہوتے ہیں۔ اسی گھاس میں جو ابھی تک گرمی اور دھوپ کے اثر سے پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ زندگی کی روسرسرانی شروع ہوتی ہے۔ اب زمین اپنے نت نئے روپ اور انوکھے رنگ دکھاتی ہے اور ہم حیران ہوتے ہیں کہ اس بے رنگی کے پردے میں اتنے رنگ تھے، اتنا کچھ چھپائے بیٹھی تھی یہ زمین۔ اور یہ رنگ دکھانے کے لیے چیخوف نے کسی قسم کے شاعرانہ بیان کو نہیں اپنایا۔ کوئی مرصع کاری نہیں کی۔

فطرت کے بیان میں لکھنے والے بالعموم اسی طرح کے کسی انداز بیان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چیخوف اس کے خلاف تھا۔ گورکی کے نام ایک خط میں اس نے اس کی اس کمزوری پہ ٹوکا تھا۔ لکھا کہ "برادر، تم لینڈ سکیپ کی تصویر کشی خوب کرتے ہو، مگر یہ جو بار بار تشبیہی انداز بیان پہ اتر آتے ہو کہ سمندر سانس لے رہا ہے، آسمان تک رہا ہے، فطرت سرگوشیاں کر رہی ہے، سٹیپی کی نرم آغوش وا ہے۔

اس سے کبھی بیان میں ایک شیرینی آجاتی ہے، کبھی بیان مبہم بن جاتا ہے۔ بہرحال اس سے ایک اکتا دینے والی یکسانیت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فطرت کا بیان سادگی مانگتا ہے۔ کچھ اس قسم کا سادہ بیان ہونا چاہیے کہ سورج ڈوب گیا، اندھیرا پھیل گیا، مینھ پڑنے لگا۔" چیخوف خود یہی کرتا ہے۔ اس کہانی میں بھی یہی طور اپنایا گیا ہے۔ پورا بیان کھری حقیقت نگاری کی مثال ہے۔ کس سادگی اور سچائی سے منظر کی جزئیات بیان کرتا چلا جاتا ہے اور اس سادہ بیان کے ساتھ ان میں جان پڑتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ سٹیپی کی نژمردہ زمین ایک زندہ جسد بن جاتی ہے۔ پورا نقشہ کتنا حقیقی ہے اور کتنا طلسماتی ہے۔ یہی تو چیخوف کا کمال ہے۔ اس کی سادہ بیانی کے واسطے سے حقیقت اپنے حقیقی جوہر کو پاتی ہے اور ایک طلسم بن جاتی ہے۔

پھر سادگی سے چڑھتے اور اترتے ہیں مگر یہی سادہ بیانی ان میں جادو پیدا کر دیتی ہے۔ ہر پہر... کے ساتھ اس گیاہستان کا ایک نیا روپ سامنے آتا ہے۔ ٹیلے کے پیچھے سے سورج کا جھانکنا، اس کی کرنوں کا ٹم ٹم کے مسافروں کو چھوتے ہوئے پھیلتے چلے جانا، دھیرے دھیرے شام کا اترنا اور افق پر کھڑی جھاڑیوں اور جہاں تہاں ایستادہ ٹیلوں کا اندھیرے میں کھسکتے چلا جانا۔ اب رات ہے۔ گاڑی بانوں نے بیچ بن میں ڈیرا کیا ہے۔ الاؤ گرم ہے۔ گھور اندھیرے کے بیچ روشنی کا ایک ہالہ۔ ذرا فاصلے پر دو صلیبیں کھڑی نظر آرہی ہیں۔ بوڑھے گاڑی بان پانتلی کو یاد آتا ہے کہ کسی گذرے زمانے میں یہاں ایک واردات گذری تھی کہ دو مسافر قتل کر دیے گئے تھے۔ اچانک فضا ڈراؤنی نظر آنے لگتی ہے۔ اب یہ خالص فطرت نہیں ہے۔ انسان کے حوالے سے اس میں جرم اور تشدد کا رنگ بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ مرحلہ بھی گذر جاتا ہے۔ اب پچھلا پہر ہے۔ گاریاں چل پڑی ہیں۔ طوفانی بارش اور بجلی کی کڑک کی صورت سٹیپی کے زمین و آسمان اپنا جلال دکھا رہے ہیں اور اگور شکا حیران اور خوفزدہ ہے

کہ گاڑیوں کے پیچھے یہ دراز قد لوگ کون ہیں کہ چپ چاپ بلم ہاتھوں میں سنبھالے چلے آ رہے ہیں۔ کہیں یہ جن تو نہیں ہیں۔

اصل میں تو ہم ایگورشکا ہی کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ایگورشکا کا ماموں تو ایک کاروباری مخلوق ہے وہ اپنی ادھیڑ بن میں ہے۔ فطرت اس سے کیا کلام کرے گی۔ پادری صاحب بھی اس سفر میں اس کے کاروباری رفیق ہیں۔ دل و دماغ کے دریچے صرف اس ننھے مسافر کے وا ہیں۔ ارد گرد کی کائنات صرف اس سے ہمکلام ہے اور اب تو اس کا ماموں اور پادری دونوں کاروبار کے سلسلے میں اور طرف نکل گئے ہیں۔ اب ایگورشکا تنہا سفر کر رہا ہے۔ اصل میں یہ سفر اسی کمسن مسافر کا سفر ہے۔ مگر یہ کس قسم کا سفر ہے۔

شروع میں تو یہ سیدھا سادہ واقعاتی قسم ہی کا سفر دکھائی پڑتا تھا، مگر اب یوں نظر آ رہا ہے کہ شاید اس کی کوئی علامتی سطح بھی ہے۔ چیخوف کے یہاں یہی تو مشکل ہے۔ کہانی حقیقت کی سطح پر چلتے چلتے جانے کب چپکے سے رستہ بدل کر علامتی سطح پر حرکت کرنے لگے۔ یا بیک وقت دونوں سطحوں پر چلتی نظر آئے۔ ایگورشکا جب سفر تمام کر کے منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے تو یہ کھلتا ہے کہ یہ سفر کا اختتام نہیں ہے، ایک نئے سفر کا حرفِ آغاز ہے۔ یہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے کی طرف سفر تھا۔ اب ایگورشکا ایک نئے دور میں قدم رکھنے لگا ہے۔ نیا دور کیسا ہو گا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ حکم لگانے اور قطعی فیصلہ صادر کرنے کا تو چیخوف قائل ہی نہیں تھا۔ یہ تو زندگی ہے۔ اس کی کوئی صورت قطعی نہیں ہوتی، بس اپنے اندر امکانات لیے ہوئے ہوتی ہے اور کہانی اس طور ختم ہوتی ہے کہ ایگورشکا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ ان آنسوؤں کے ساتھ وہ "اس نئی انجانی زندگی کا استقبال کرتا ہے جو اب شروع ہونے لگی تھی۔ جانے کیسی ہو یہ زندگی"۔

یہ کہانی ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی تھی اور شاید چیخوف کی پہلی لمبی کہانی تھی۔ ابھی تک

اس کا قلم مختصر افسانے کی حدود میں اپنے جوہر دکھا رہا تھا۔ ویسے بھی چیخوف کا جوہر اسی صنف میں آشکار ہوا ہے۔ وہ کہانیاں جو مختصر افسانے کی حدود کو عبور کر کے مختصر ناول کی شکل اختیار کرتی نظر آئی ہیں۔ محدود تعداد میں ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ لمبی کہانیاں اپنی اپنی جگہ بہت کمال کی کہانیاں ہیں۔ سٹیپی اس نوعیت کی پہلی کہانی ہے جسے ہم مختصر ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ چیخوف کا قلم یہاں پہلی مرتبہ اختصار کے ہنر کو چھوڑ کر تفصیلی بیان پر مائل نظر آتا ہے۔ اس کا اسے خود بھی احساس ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے۔

"مجھ میں ابھی لمبی چیز لکھنے کا ملکہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ پھر میں کاہل وجود بھی ہوں۔ مختصر نویسی نے میری عادت خراب کر دی ہے۔"

چونکہ قلم لمبی چیز لکھنے کے لیے پہلی مرتبہ اُٹھا ہے۔ اس لیے اُسے یہ ڈر بھی لگا ہوا ہے جس کا اظہار اس خط میں ہوا ہے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ اتنا لکھنے کے بعد ایک پھسپھسی کہانی برآمد ہو۔ مگر اسی کے ساتھ ایک شوق کا عالم بھی ہے۔ لکھتا ہے:

"میں عجلت میں نہیں ہوں۔ جیسے چٹورے چڑیوں کا سالن مزے لے کر کھاتے ہیں بس ایسے ہی میں یہ کہانی دھیرے دھیرے ایک کیفیت کے ساتھ ایک شوق کے عالم میں لکھ رہا ہوں۔"

کہانی جس کیفیت کے ساتھ اور جس شوق کے عالم میں لکھی گئی ہے اس کا ترجمہ بھی اسی کیفیت اور اسی عالم شوق کا طالب تھا۔ پتہ نہیں میں ترجمہ میں کس حد تک حق ادا کر سکا ہوں۔ ہاں آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ترجمہ کرتے ہوئے میرے پیش نظر دو انگریزی ترجمے تھے ایک کانسٹن گارنٹ کا ترجمہ اور دوسرا وہ ترجمہ جو ماڈرن لائبریری ایڈیشن میں شامل ہے۔

انتظار حسین

۲۰ر اگست ۸۹ء

(۱)

جولائی کے دن تھے۔ صبح سویرے منہ اندھیرے ایک ٹم ٹم بے سپرنگ کی، طوفانِ نوح سے پہلے کے وقتوں کی، کہ بیٹھنے والے کی ہڈی پسلی ایک کر دے نون نام والی بستی سے کہ ض نامی ضلع کی صدر بستی ہے ٹخ ٹخ کرتی کھڑکھڑاتی نکلی اور باہر جانے والی سڑک پہ پڑلی۔ بیوپاری، غریب پادری گلے ملنچھے، روس میں تو اب بس یہی لوگ اس سواری میں بیٹھتے ہیں تو یہ ٹم ٹم کھڑکھڑ کرتی چرخ چوں چرخ چوں کی آوازیں نکالتی چلی جا رہی تھی پیچھے بندھا ڈول بھی سر میں سر ملا رہا تھا۔ یہ آوازیں اور ادھر اندر کا پیٹھا پرانا استر، باہر لٹکتے چیتھڑے گودڑے یہ سب مل کر چغلی کھا رہے تھے کہ ٹم ٹم باوا آدم کے زمانے کی ہے اور اس کے انجر پنجر اب بکھرے کہ اب بکھرے۔

اس ٹم ٹم میں نون بستی کے دو باسی سوار تھے ایک تو بیوپاری ایواں اپویچ کزمیشون جن کی ڈارھی مونچھیں صاف تھیں۔ عینک لگا رکھی تھی۔ سر پہ تنکوں والا ہیٹ جما رکھا تھا۔ اس حلیہ میں وہ بیوپاری سے زیادہ ایک دفتری مخلوق دکھائی پڑتے تھے۔ دوسرے تھے فادر کرسٹفر سرسکی نون بستی کے گرجا گھر کے بوڑھے پادری صاحب، پستہ قد، لمبے بال بریں مٹیلے استر والی کفتان، سر پہ چوڑے کناروں والا ہیٹ۔ کمر میں کار چوب کی رنگین پیٹی اول الذکر اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا اونگھ آتی تو سر کو جھٹکتا اور ہشیار ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی ایک کاروباری آدمی والی روکھی پھیکی کیفیت اس وقت ان احساسات کے ساتھ گتھی ہوئی تھی جو اپنی بستی سے نکلتے ہوئے آدمی کے یہاں کہ اس نے خوب چھٹھا

بھی رکھی ہے ابھرتے ہیں۔ دوسرے تھے پادری صاحب جو بڑے ذوق و شوق سے خداوند کی زمین کا نظارہ کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور ایسی پھیلی ہوئی کہ جیسے پھیلتے پھیلتے ان کے ہیٹ کے کناروں کو جا چھوئے گی۔ چہرہ لال بھبوکا۔ دیکھ کے لگتا تھا کہ جیسے وہ ٹھنڈے یخ ہیں یہ دونوں کرمیشون اور پادری کرسٹفر آون کا بیوپار کرنے کے لئے گھر سے نکلے تھے۔ گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا تھا اور اگرچہ وہ بہت سویرے گھر سے چلے تھے پھر بھی انہوں نے خوب چڑھائی تھی۔ سو اس وقت وہ دونوں ہی بہت مگن تھے۔

تو ایک تو یہ دو تھے جن کا ذکر ہوا۔ اور ایک کوچوان ونیسکی جو اپنے کمیت ٹھگنے گھوڑوں کی جوڑی کو بے تکان چابک رسید کئے چلا جا رہا تھا۔ مگر ان کے سوا ایک سواری اس ٹم ٹم میں اور بھی تھی۔ ایک چھوٹا سا لڑکا یہی کوئی نو کا سن ہوگا۔ چہرہ جیسے دھوپ سے سنولا گیا ہو۔ اور آنسوؤں میں تربتر۔ یہ کرزمیشون کا بھانجا ایگوروشکا تھا۔ ماموں کے فیصلہ کے مطابق اور پادری صاحب کے اشیرواد کے ساتھ وہ سکول میں داخلہ کے لئے جا رہا تھا۔ اسکی ماں تھی اولگا افنوفنہ کہ ایک کالجیٹ سیکرٹری کی بیوہ اور کرزمیشون کی بہن تھی۔ شائستہ لوگوں اور مہذب سوسائٹی کی شیدائی تھی۔ بھائی کو اون کے بیوپار کے لئے بستی سے باہر جاتے دیکھا تو گڑگڑا کر کہا کہ بھیا ایگوروشکا کو بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ وہاں اسے کسی جمنازیم میں داخل کرا دینا۔ سو اب یہ لڑکا اس سے بے خبر کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اور کیوں جا رہا ہے ڈینسکی کے برابر کی نشست پر جما بیٹھا ہے، اپنی کہنی کو ٹکائے ہوئے اس اندیشہ سے کہ کہیں وہ چلتے داتی کی طرح لڑھک نہ جائے یا اچھل کر پیچھے نہ جا پڑے۔ ٹم ٹم اس تیزی سے دوڑی چلی جا رہی ہے کہ اس کی سرخ قمیص سے اس کی پیٹھ پر غبارہ بنا ہوا ہے اور اس کا نیا ہیٹ جس میں مور کا پر ٹنکا ہوا ہے اس کے سر سے پیچھے کی طرف کھسک گیا ہے اسے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ دنیا کی سب سے بد نصیب

مخلوق ہے اس کا دل کر رہا ہے کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

ٹم ٹم جیل کے قریب سے گزرتی ہے تو ایگو رولشکا دیکھتا ہے کہ سنتری سفید اونچی دیوار تلے آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہے۔ پھر اس کی نظر سلاخوں والی کھڑکی پر جاتی ہے پھر چھت پر نصب چمکتی صلیب پر جا ٹکتی ہے اور اسے ہفتہ بھر پہلے کا خیال آتا ہے جب کزن والی سینٹ میری کی حاضری ہوئی تھی اور وہ اپنی امی کے ساتھ جیل والی گرجا میں گیا تھا اور وہاں عیسیٰ مسیح کا تونسہ کھایا تھا اور اس سے پہلے ایسٹر کے موقعہ پر وہ لڈمل خانساماں اور ڈینیسکی کے ہمراہ جیل کے گرجا گھر بس گیا تھا اور وہاں ان کے ساتھ مل کر ایسٹر کیک انڈے پیسٹریاں اور بھنا گوشت ڈٹ کر کھایا تھا۔ قیدیوں نے ان کا کتنا شکریہ ادا کیا تھا۔ اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنایا اور ایک قیدی نے اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا ٹین کا قمیص والا بٹن اُسے تحفہ کے طور پر دیا تھا۔

لڑکے نے ان سب جانی پہچانی جگہوں پر نظر دوڑائی۔ مگر کم بخت ٹم ٹم تیزی سے گزرتی چلی گئی اور وہ سب جگہیں آنکھوں سے اوجھل ہوتی چلی گئیں۔ جیل سے آگے نکل کر کالی دھوئیں میں رچی لوہے کی بھٹی دم بھر کے لئے نظر آئی اور اوجھل ہو گئی۔ پھر وہ پرسکون ہرا بھرا قبرستان دکھائی دیا جس کے گرداگرد آڑے ترچھے پتھروں کی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ قبرستان کی دیوار کے اس طرف سے صلیبیں اور یادگاری تختیاں جھانک رہی تھیں یہ صلیبیں اور تختیاں سے شاہ دانے کے درختوں کی ہریاول کے بیچ سفید سفید دھبوں کی مثال نظر آ رہی تھیں۔ اسے وہ دن یاد آ گئے جب شاہ دانے کے درختوں پہ بہار آتی ہے اور جب ان دنوں یہی سفید سفید دھبے ان کلیوں میں اس طور کھل مل جاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ جھاگ کا ایک سمندر امنڈا ہوا ہے اور جب شاہ دانہ پک جاتا ہے تو یہی سفید تختیاں اور صلیبیں یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے ان پہ اودا ہٹ مائل سرخ سرخ چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ اس دیوار کے اس طرف شاہ دانے کے ہرے بھرے درختوں تلے اس کے ابا جان اور دادی اماں زینیدہ وسیلو فنادن رات کے چکر سے بے نیاز سوئے پڑے ہیں۔ جب دادی اماں کی آنکھ بند

ہوئی تھی تو لوگوں نے انہیں ایک لمبے نیلے تابوت میں لٹا دیا تھا اور چونکہ ان کی آنکھیں بند نہیں ہو رہی تھیں اس لئے انھوں نے ان کی دونوں آنکھوں پر پانچ پانچ کوپک کے دو سکے رکھ دیئے تھے۔ دادی اماں آخر دم تک ہشاش بشاش رہیں کس پابندی کے ساتھ بازار جاتیں اور بھوکے بھوکے لیکٹ لے کے آتیں جن پہ خشخاش چھڑکی ہوتی تھی۔ مگر اب وہی دادی اماں سوئی پڑی ہیں۔ ہاں سوئی پڑی ہیں۔

بھٹے کے گزرنے کے ساتھ ہی بستی ختم ہو گئی۔ اب سامنے کھلی فضا تھی۔ ایگوروشکا نے بستی پہ آخری نظر ڈالی۔ پھر ڈینسکی کی بغل میں منہ سٹا دیا اور سسکیاں لے کے رونے لگا۔

"بہت خوب۔ ابھی تمہارا رونا بلکنا بند نہیں ہوا" کزمشوف بولے۔

"بھئی اس لڑکے نے تو پھر ٹسوئے بہانے شروع کر دیئے اگر نہیں جانا چاہتے تو مت جاؤ۔ تمہارے ساتھ کسی نے زبردستی تو نہیں کی ہے"

"بیٹے اس میں رونے کی کونسی بات ہے۔ مت روؤ۔ مت روؤ" پادری کرسٹفر نے تیز تیز بولنا شروع کیا۔

"میرے بچے روؤ مت۔ خداوند کا نام لو۔ تم کسی برے کام کے لئے تو نہیں جا رہے ہو۔ اس میں تمہارے لئے بھلائی ہی ہے۔ برائی کی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ علم روشنی ہے اور جہالت تاریکی ہے۔ بالکل صحیح بات ہے"

"تم واپس جانا چاہتے ہو؟" کزمشوف نے پوچھا۔

"ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہیں۔۔۔" سسکیاں بھرتے بھرتے ایگوشکا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ واپس چلے جاؤ"

"میرے بچے مت روؤ" پادری کرسٹفر پھر بول پڑے۔

"خداوند کا نام لو ۔ ۔ ۔ ۔ " منو شوف بالکل اسی طرح گھر سے نکلا تھا اور اس نے وہ نام پیدا کیا کہ پورے یورپ میں اس کی دھوم مچ گئی۔ علم اگر ایمان کی سلامتی کے ساتھ حاصل ہو تو خداوند کی رضا سے اس کا اچھا پھل ملتا ہے۔ ذرا غور کرو کہ عبادت کے کلمات کیا ہیں۔ برائے شانِ پاک پروردگار، برائے عافیت والدین۔ برائے ترقی دین و وطن ۔ ۔ ۔ بے شک بے شک۔"

"فائدہ بھی سب کو نہیں پہنچتا"، کزمنشوف نے ایک سستے قسم کا سگار سلگایا۔

"ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بیس بیس سال پڑھائی کرتے ہیں۔ پھر بھی انہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔"

"علم سے کچھ لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر ان کے دماغ میں فتور پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر میری بہن کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ اس پہ تو علم و تہذیب کا بھوت سوار ہے۔ چاہتی ہے کہ کسی طرح اس کا بیٹا عالم فاضل بن جائے اس کی بدبختی میں یہ بات نہیں آتی کہ میں اسے اپنے کاروبار میں لگا کے اس قابل بنا سکتا ہوں کہ زندگی بھر چین کرے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہر آدمی عالم فاضل بننے کی سوچنے لگے اور ہر ایک کو مہذب و شائستہ بننے کا خبط ہو جائے تو پھر اناج کون بوئے گا۔ اور بیوپار کون کرے گا۔ پھر تو سب بھوکے مر جائیں گے۔"

"اور اگر سب اناج بونے اور بیوپار کرنے میں لگ جائیں تو پھر حصولِ علم کے لئے کون بچے گا۔"

دونوں کو اپنی اپنی جگہ احساس ہوا کہ دوسرے نے جو بات کہی ہے اس میں کچھ وزن ہے سو دونوں ہی پہ سنجیدگی طاری ہو گئی۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ کھنکارے۔

دینسکی غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اور اپنی نشست پر کھڑے ہو کر اپنے کمیت گھوڑوں پر چابک برسانے شروع کر دیئے۔

اتنے میں ایک وسیع و عریض بے انت میدان ابھر کر نظروں کے سامنے آ گیا کہ اس کے گرداگرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا آپس میں گڈمڈ، ایک دوسرے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی یہ پہاڑیاں اس ابھرتی زمین میں گھل مل گئی تھیں جو دور افق تک پھیلتی چلی گئی تھی اور ہلکی اودی دوریوں میں جا کر گم ہو گئی تھی آدمی چاہے جتنا چلتا چلا جائے۔ پر اسے پتہ نہیں چلے گا کہ یہ پھیلی ہوئی زمین کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔

سورج نکل آیا تھا بستی کے اس طرف سے کہ اب ان کے عقب میں تھی جھانک رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چپکے چپکے اس نے اپنی دن کی کارروائی شروع کر دی تھی پہلے تو دور فاصلہ پر چمکتی دمکتی پیلی پیلی روشنی کا ایک چوڑا سا دھبہ پھیلتا دکھائی دیا اس مقام پر جہاں ایک ٹیلہ کھڑا تھا اور پون چکی تھی جو دور سے یوں دکھائی پڑتی تھی جیسے کوئی ٹھگنا آدمی اپنے بازو گھما رہا ہے۔ گھڑی بعد ویسی ہی روشنی کی ایک دھاری تھوڑی قریب جھلملائی، سیدھے ہاتھ کی طرف رینگتی دکھائی دی۔ رینگتے رینگتے پہاڑیوں کو جا لیا اور ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ایگورشکا کو اپنی ریڑھ کی ہڈی پر ایک حرارت کا سا احساس ہوا۔ روشنی کی لکیر چپکے چپکے پیچھے سے آئی۔ ٹم ٹم اور گھوڑوں کے بیچ لہرائی اور دیکھتے دیکھتے اس ساری کی ساری وسیع و عریض زمین نے صبح کے دھندلکے کو جھٹک کر الگ کیا اور شبنمی قطروں سے سج بن کر مسکرانے جھلملانے لگی۔

کٹا ہوا اناج، میدانی گھاس، خام پٹ سن، پودوں پہ جمی سبز کاہی۔ اس سب میں کر گرمی سے اس بیمزہ سی کھنڈ گئی تھی اور مردنی چھا گئی تھی اوس میں بھیگنے اور سورج کی

گہرائی سے پھر جان پڑ گئی جیسے پھر اس سے کلے پھوٹ پڑیں گے۔ ایک چنکبری چڑیا کلکاری مارتی سامنے سے اڑتی چلی گئی۔ گھاس میں سرسراتی سائیں سائیں گلہریوں نے کٹ کٹ کرنی شروع کر دی جیسے ایک دوسرے کو پکار رہی ہوں۔ بائیں سمت میں دور کہیں پہاڑی کوا بولا۔ تیتروں کا ایک جھنڈ ٹم ٹم کی آواز پہ چونک کر ہڑبڑا کے اڑا اور اپنے پروں کی نرم پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ پرواز کرتا دور پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ ٹڈوں، جھینگروں، چوہوں چوہیوں چھچھوندروں نے چیں چیں شروع کر دی اور یوں گھاس کے بیچ ایک بھنبھناہٹ کا تار بندھ گیا۔

مگر تھوڑی ہی دیر میں اوس بھاپ کی مثال اڑ گئی۔ ہوا کی تازگی جاتی رہی اور اس درختوں سے محروم گھاس سے بھرے میدان نے جولائی کی گرم رت کا جلوہ دکھانا شروع کر دیا۔ گھاس پہ پژمردگی چھا گئی اور جیتی جاگتی رنگا رنگ آوازیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ دھوپ میں تپتی کچھ کچھ بھوری کچھ کچھ ہری پہاڑیاں، لمبے فاصلے کر دور جا کر ایک اودی اودی سکون بھری چھاؤں میں گھل گئے تھے، پھیلا ہوا میدان جس کی حد میں ایک دھندلے میں گم تھیں، اوپر چھایا ہوا گنبد وار گوں کی مثال آسمان ——— اور آپ جانیں کہ ان میدانوں میں جہاں نہ اونچے پہاڑ ہوتے ہیں نہ گھنے جنگل ہوتے ہیں آسمان اتنا شفاف اتنا گہرا نظر آتا ہے کہ اس سے ڈر لگنے لگتا ہے ——— تو اس گھڑی یہ سارا کچھ اتھاہ بے انت دکھائی دے رہا تھا۔ اور پورے منظر پہ افسردگی کا ڈیرا تھا۔

فضا کتنی بے رنگ کتنی اداس ہے۔ ٹم ٹم ٹخ ٹخ کرتی چلی جا رہی ہے اور ایگور شکا وہی ایک نقشہ دیکھے چلا جا رہا ہے ——— میدان، آسمان، پہاڑیاں، گھاس کے بیچ سے جو بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں وہ سب تھم چکی ہیں۔ چنکبری چڑیا اڑتے اڑتے کہیں دور نکل گئی ہے۔ تیتر بھی اب کوئی دکھائی نہیں پڑ رہا۔ پہاڑی کووں نے اپنی بیکاری سے تنگ آ کر اڑنا شروع کر دیا ہے۔ پھیلی ہوئی پژمردہ گھاس پر بلا وجہ بلا سبب

منڈلا رہے ہیں۔ یہ پہاڑی کوے کتنے یک رنگ ہیں۔ ان کی یک رنگی نے اس میدان میں کہ پہلے ہی یک رنگی کا اسیر ہے مزید یک رنگی پیدا کر دی ہے۔

اوپر بلندیوں میں ایک چیل اپنے لہراتے بازوؤں کے ساتھ تیرتی چلی جا رہی ہے تیرتے تیرتے اچانک تھم جاتی ہے جیسے اسے جینے کی لغویت کا دھیان آگیا ہو۔ پھر اپنے بازوؤں کو جنبش دیتی ہے اور تیر کی طرح سنسناتی اڑتی چلی جاتی ہے کون جانے وہ کیوں اڑ رہی ہے اور کیا چاہتی ہے۔ دور فاصلہ پر پون چکی کے پر گردش میں ہیں۔

یک رنگی کا سلسلہ تھوڑا ٹوٹتا ہے۔ لمبی لمبی گھاس کے بیچ کوئی سفید سفید چھلکا سا پڑا دکھائی دیتا ہے یا کوئی سنگریزہ ہے کہ چمک رہا ہے۔ روڑوں پتھروں کی ایک ڈھیری دکھائی دیتی ہے۔ بید کا ایک سوکھا سفید درخت جس کی پھننگ پہ نیلے پروں والا ایک کوّا بیٹھا ہے۔

پھر ایک گلہری نمودار ہوتی ہے اور تیزی سے سڑک عبور کرتی نظر آتی ہے۔ دم بھر کے لئے یہ چیزیں ایک ایک کر کے دکھائی دیتی ہیں اور اوجھل ہو جاتی ہیں پھر وہی لمبی لمبی گھاس وہی پہاڑیاں، وہی منڈلاتے پہاڑی کوّے۔

اسے لو، خدا خدا کر کے آدمی کی صورت نظر آئی۔ اناج کے گٹھوں سے لدی بھندی ایک گاڑی چلی آ رہی ہے۔ ان گٹھوں پر ایک لڑکی لیٹی ہے۔ آنکھوں میں اس کے نیند بھری ہے۔ گرمی نے برا حال کر رکھا ہے ایک ذرا سر اٹھا کر ان مسافروں کی طرف دیکھتی ہے۔ ونیسکی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ گھوڑوں نے اناج کی بالوں کی طرف اپنی تھوتھنیاں بڑھائیں ٹم ٹم گاڑی کے قریب آکر اک دم سے جو رکی تو اس کے پہیوں سے چرخ چوں کی تیز آوازیں نکلیں اور اناج کی چند بالیاں پادری کرسٹفر کے ہیٹ پر آکر بالکل ہار کی طرح سے گرداگرد لپٹ گئیں۔

”موٹو، تو ہمارے اوپر کیوں چڑھی آ رہی ہے“، ونیسکی تڑپ کر بولا۔

"اور یہ تیرا منہ کیوں پھول کے کُپّا ہو رہا ہے۔ کیا بھڑ نے کاٹ کھایا ہے؟"

لڑکی اونگھتے اونگھتے تھوڑا مسکراتی ہے۔ منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہے اور پھر لیٹ جاتی ہے۔

وہ دیکھو فلاں پہاڑی کی پرلی طرف ایک چنار کا پیڑ اکیلا کھڑا ہے۔ یہ پیڑ یہاں کس نے لگایا۔ اور یہ آخر یہاں کیوں کھڑا ہے۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔ ہرا بانا، ستواں شکل، آدمی دیکھے تو بس دیکھتا ہی رہے۔ کیا یہ خوبصورت درخت یہاں خوش ہے گرمیوں میں نڑلاخے کی گرمی، جاڑوں میں کڑاکے کا جاڑا اور ٹھنڈی سنخ ہوائیں، خزاں میں قیامت کی راتیں جب سوائے کہرے کے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا اور سوائے غضب ناک جھکڑوں کے شور کے کوئی آواز سنائی ہی نہیں دیتی۔ تنہائی اس پر مستزاد۔ جب تک کی زندگی ہے اسے یہاں اکیلا بالکل اکیلا کھڑا رہنا ہے اور اس چنار کے پرلی طرف کھلتے پیلے رنگ کا ایک فرش سا بچھا ہے۔ گیہوں کی بالوں کے ڈھیر کے ڈھیر پہاڑیوں کی بلندیوں سے چلتے ہیں اور پھسلتے پھسلتے سڑک کے کنارے جا لگتے ہیں۔ ٹیلوں پر گیہوں کاٹا جا رہا ہے۔ اس کے گٹھے بنائے جا رہے ہیں۔ تلی میں اب تک فصل کھڑی دکھائی دے رہی ہے۔ کٹائی کرنے والے چھ ہیں کہ ایک قطار میں بیٹھے درانتی چلا رہے ہیں۔ ان کی چمکتی درانتیاں ایک ہی آہنگ سے چل رہی ہیں اور ایک ہی آواز پیدا کر رہی ہیں۔ درر درر، درر درر۔ جس انداز سے عورتیں بالیوں کے گٹھر بنا رہی ہیں، کٹائی کرنے والوں کے چہروں کی جو کیفیت ہے، درانتیوں کے پھلوں پر جو چمک پڑ رہی ہے اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گرمی کس بلا کی ہے۔ ایک کالا کتا زبان نکالے کٹائی کرنے والوں کے پاس سے اٹھ کر ٹم ٹم کی طرف لپکتا ہے۔ ویسے تو وہ صریحاً بھونکنے کی نیت ہی سے چلا ہے مگر جاتے جاتے ٹھٹھک جاتا ہے اور دینیکی کو جس نے اسے ڈرانے کے لئے چابک اٹھا رکھا ہے بے اعتنائی سے دیکھتا ہے۔ اس قیامت کی گرمی میں بھلا بھونکا جا سکتا ہے۔ ایک عورت کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی دکھتی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اگیو رشکا کی لال قمیص کو تکنے لگتی ہے۔ عورت کو قمیص کا رنگ بھا گیا ہے یا

اسے اپنے بچے یاد آرہے ہیں۔ بہر طور وہ دیر تک کھڑی چپ چاپ ان گزرنے والوں کو تکتی رہتی ہے۔

اور اب گیہوں نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ پھر وہی دور تک پھیلا ہوا تپتا میدان جھلستی پہاڑیاں، جلتا بلتا آسمان۔ اور پھر ایک چیل ہوا میں تیرتی نظر آتی ہے۔ دور اتنی ہی دور جلتی دور پہلے نظر آئی تھی پون چکی کے پنکھ گردش میں ہیں، لگتا ہے کہ جیسے کوئی باشیتا اپنے بازو گھما رہا ہو۔ اس کی طرف دیکھنا ایک تھکا دینے والا عمل ہے۔ لگتا ہے کہ یہ لوگ اس تک کبھی نہیں پہنچ پائیں گے۔ ٹم ٹم جتنی اس کی طرف بڑھتی جاتی ہے وہ اتنی ہی آگے کھسکتی جاتی ہے۔

پادری کرسٹفر اور کرمشوف دونوں چپ تھے۔ دینسکی نے اپنے کمیت گھوڑوں کو چابک رسید کیا اور ڈانٹ بتائی۔ ایگور تشکار رو دھو کر چپ ہو گیا تھا۔ اب وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ گزرتے مناظر کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایک تو اس میدانی علاقے کی بے رنگی اوپر سے گرمی، اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ اسے بری طرح ہچکولے لگ رہے تھے۔ ساتھ ہیں یہ احساس کہ جیسے اس کی پیٹھ تپ رہی ہے۔ ابھی تو دس کوس بھی پورے نہیں ہوئے تھے اور اس نے ابھی سے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ ذرا رک کر ستا لینا چاہیئے۔ اس کے ماموں کے چہرے سے شفقت کی کیفیت دھیرے دھیرے کر کے زائل ہو چکی تھی اب اس چہرے سے ایک کاروباری آدمی کی خشونت ٹپک رہی تھی۔ سنولا چہرہ، ڈاڑھی مونچھیں صاف، آنکھوں پر عینک چڑھی ہوئی، کنپٹی اور ناک میں گرد اٹی ہوئی، اس شکل وشباہت میں جب خشونت بھی شامل ہو گئی۔ تو وہ چہرہ ایک سنگدل آدمی ایک محتسب کا چہرہ نظر آنے لگا۔ پادری کرسٹفر خداوند کی زمین کا اسی ذوق وشوق سے نظارہ کئے چلے جا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے کسی خوشگوار اور پاکیزہ سے خیال میں کھوئے ہوئے تھے اور چہرے پر ایک شفقت بھری مہربان مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی خوشگوار پاکیزہ

خیال نے گرمی کے اثر سے ان کے دل و دماغ میں راہ پائی ہے۔

"کیوں بھئی دینسکی کیا خیال ہے تمہارا۔ ہم گاڑیوں کو جا پکڑیں گے؟" کزمشوف نے سوال کیا۔

دینسکی نے ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ پھر سنبھل کر بیٹھا۔ گھوڑوں کو چابک رسید کیا۔ پھر بولا

"رب نے چاہا تو رات کے آتے آتے ہم انہیں جا پکڑیں گے۔"

اتنے میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ موٹے تازے بھیڑیوں کی سی شکل کے شیپرز کے چھ کتے ایسے لپک کر آئے جیسے گھات میں بیٹھے تھے۔ وحشیانہ غراتے ہوئے ٹم ٹم پر جھپٹے۔ یہ کل چھ تھے۔

بالوں سے بھری نوکیلی تھوتھنیاں، لال لال غضب ناک آنکھیں سانس صورت کے ساتھ وہ بہت ہی خوفناک نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ٹم ٹم کو گھیر لیا اور ایسے بھونکنا شروع کیا جیسے شرط بدی ہو کہ کون زیادہ بڑھ کر بھونکتا ہے۔ ان کے تیوروں سے ایسی نفرت ٹپک رہی تھی جیسے وہ بس پل پڑیں گے اور گھوڑوں کی، ٹم ٹم کی سواریوں کی بوٹی بوٹی کر دیں گے اور ٹم ٹم کے پرخچے اڑا دیں گے۔ دینسکی کو تو چابک مارنے اور ڈانٹنے پھٹکارنے میں مزہ آتا تھا۔ اسے ایسا موقع خدا دے۔ بھنا کر چابک گھمایا اور اک ذرا جھک کر سڑاک سے ان کو رسید کیا۔ کتے اور زیادہ بھپرے اور زیادہ بھاری آواز میں بھونکنا شروع کیا۔ گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔ ایگوزشکا بڑی مشکل سے اپنی نشست پر لٹکا ہوا تھا۔ کتوں نے جس طرح دانت نکوسے ہوئے تھے اور جس طرح ان کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اس سے اس نے سمجھ لیا کہ اگر کہیں وہ ٹم ٹم سے گر پڑے تو یہ کتے دم بھر میں اس کی تکا بوٹی کر دیں گے لیکن وہ بالکل نہیں ڈرا۔ جیسے قہر بھرے تیور دینسکی کے تھے۔ ویسے ہی اس کے بھی تھے بس اسے ایک افسوس تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی ایک ہنٹر کیوں نہیں ہے۔

ٹم ٹم بھیڑوں کے ایک گلے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ "رکو"، کزمشوف نے

چلا کر کہا۔

وینسکی بالکل پیچھے کی طرف ہو گیا جیسے بیٹ گیا ہو۔ اس طور اس نے گھوڑوں کی باگیں کھینچیں۔ ٹم ٹم ایک دم سے رک گئی۔

"ادھر آؤ۔" کنزمشوف نے گڈریئے کو پکارا "دیکھو ان ملعون کتوں کو روکو۔"

ایک بوڑھا گڈریا، پھٹے حالوں، ننگے پاؤں، سر پہ دبیز ٹوپا، کمر میں ایک میلا کچیلا لبادہ لپٹا ہوا، ہاتھ میں بلم، بالکل جیسے پرانے عہدنامے کا کوئی کردار، ہو اس نے کتوں کو چپ کرایا اور سر سے ٹوپا اتار کر ٹم ٹم کی طرف بڑھا۔ اسی رنگ ڈھنگ کا ایک اور شخص مانو پرانے عہدنامے کا ایک اور کردار گلے کے ایک طرف ساکت کھڑا تھا اور ایک بے تعلقی سے مسافروں کو تک رہا تھا۔

"یہ گلہ کس کا ہے؟" کنزمشوف نے پوچھا۔

"ورلموف صاب کا۔"

بوڑھے شخص نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

"اچھا، اچھا۔ ہاں ورلموف صاحب کل رات ادھر سے گزرے تھے۔ یا نہیں؟"

"نہیں صاب جی۔ . . . . ہاں ان کے دیوان جی ادھر سے ہوتے ہوئے گئے ہیں۔ اور کوئی نہیں۔"

"اچھا جاؤ۔"

ٹم ٹم آگے بڑھ گئی۔ اور گڈریئے اور ان کے بدذات کتے پیچھے رہ گئے۔ ایگورشکا نے نادانستہ دور اودے اودے دھندلکوں میں گم فاصلوں کو تکنا شروع کر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ پون چکی اپنے گھومتے پنکھوں کے ساتھ اب قریب آتی جا رہی ہے۔ وہ اور بڑی اور بڑی ہوتی چلی جا رہی تھی اور اب اس کے پنکھ کسی قدر صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ ایک پنکھ پرانا دھرانا۔ اس پہ چکتے پڑے ہوئے۔ دوسرا پنکھ نیا نیا لکڑی کا بنا ہوا بالکل

چکنا پالش کیا ہوا کہ دھوپ میں چمک رہا تھا۔

ٹم ٹم سیدھے ہاتھ پر مڑ گئی اور پون چکی الٹے ہاتھ کی سمت میں کھسکنے لگی۔ ان کی سواری سیدھے ہاتھ والے راستے پر بڑھتی چلی جا رہی تھی اور پون چکی پیچھے کی طرف کھسکتی جا رہی تھی مگر پھر بھی دکھائی دیتے چلی جا رہی تھی۔

"بولنتف کے بیٹے نے کیا شاندار پون چکی بنائی ہے!" دبنسکی کہنے لگا۔

"اس کے کھیت ابھی دکھائی نہیں دیئے؟"

"وہ رہے، ادھر وادی میں۔"

پھر جلدی ہی بولنتف کے کھیت دکھائی دینے لگے۔ مگر پون چکی ابھی تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ ایگورشکا کو بدستور تکے جا رہی تھی۔ اپنے صاف چکنے پنکھ کو گھما گھما کر اشارے کر رہی تھی۔ پون چکی تھی کہ جادوگر۔

---

(۲)

دوپہر ہو چلی تھی کہ ٹم ٹم سڑک سے اتر کر سیدھے ہاتھ کو ہو لی اور آہستہ آہستہ چل کر
تھوڑے فاصلہ پر جا کر رک گئی۔ ایگورشکا کو ایک نرم دھیمی سکون بھری سرسراہٹ سنائی دی
اور یوں محسوس ہوا کہ ایک عجب سی ہوا کی طرح کی کوئی ٹھنڈی نرم سی شے اس کے چہرے
کو چھو رہی ہے۔ فطرت نے کیا کارستانی دکھائی تھی کہ چند بھاری بھرکم بے ڈھب پتھروں
کو الٹا سیدھا چنا اور ایک ٹیلہ کھڑا کر دیا۔ اس ٹیلہ سے پانی کی ایک پتلی دھار بہہ رہی تھی
ایک کھوکھلے تنے سے بہتی ہوئی جیسے یہاں کسی بھلے مانس نے رکھا ہوگا۔ دھار کتنی صاف شفاف
تھی۔ اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی زمین پر گر رہی تھی۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی ہلکا شور کرتی ہوئی
جیسے وہ اپنے آپ کو کوئی تند و تیز چشمہ سمجھ رہی ہو۔ یوں تیز بہتی ہوئی یہ دھارا کہیں بائیں
سمت میں نکل گئی تھی۔ ٹیلے سے تھوڑا قریب ایک تلیا تھی جس میں یہ دھارا جا ملی تھی۔
لیکن جلتی دھوپ اور پیاسی زمین نے اس کا بہت سا پانی چوس کر اس کا زور توڑ دیا تھا
لیکن یہ تلیا شاید تھوڑی دور بہہ کر ایک نالے سے جا ملی تھی کہ اس کے کنارے کنارے ٹیلے سے
کوئی سو ڈیڑھ سو قدم کے فاصلہ پر ترسل کے ہرے بھرے گھنے جھنڈ لہرا رہے تھے۔ قریب سے
ٹم ٹم گزری تو لمبی چونچوں والی تین چڑیاں جھنڈوں سے چیختی چلاتی نکلیں اور اڑ گئیں۔

مسافروں نے نالے کے کنارے ڈیرا کیا کہ تھوڑا آرام کر لیں اور گھوڑوں کو بھی کھلا پلا
لیں۔ گھوڑوں کو کھول دیا گیا۔ ان بے جتے گھوڑوں اور ٹم ٹم کے کھڑے ہونے سے جو برائے

برائے نام سایہ ہوا۔ اس میں چٹائی بچھائی گئی۔ کرمشوف پادری کرسٹفر اور ایگورشکا تینوں اس پر بیٹھ گئے۔ تھوڑا کھایا پیا۔

جب پادری کرسٹفر نے ایک ابلا انڈا پیٹ میں اتار لیا اور ٹھنڈا پانی پیا تو وہ جو گرمی کے طفیل ان کے دماغ میں ایک خوشگوار پاکیزہ خیال نے جنم لیا تھا وہ کلبلانے لگا۔ آخر اس نے اظہار کی راہ پائی۔ انہوں نے شفقت بھری نظروں سے ایگورشکا کو دیکھا اور نوالہ چباتے چباتے بولے "بیٹے، میں نے بھی کسی زمانے میں پڑھا لکھا تھا۔ خیر میری تو مثال لانی ہی نہیں چاہیئے۔ میری بات اور تھی۔ اول دن ہی سے خداوند تعالے نے مجھے ایسی سمجھ ودیعت کی تھی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جب میں تمہاری عمروں کا تھا اسی زمانے میں میں نے اپنی ذہانت سے اپنے والدین اور اپنے استادوں کا دل موہ لیا تھا۔ ابھی میں پندرہ کے سن میں بھی نہیں پہنچا تھا مگر عالم یہ تھا کہ میں لاطینی میں شعر کہہ لیتا تھا اور اتنی ہی روانی سے جتنی روانی سے روسی میں کہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے لاٹ پادری مدظلہ العالی کرسٹفر کی عصا برداری کی تھی۔ ایک دفعہ ماس کے بعد کیا ہوا، مجھے یہ ایسے یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ وہ فخر الاتقیا خلد آشیاں شہنشاہ الکنہ فڈر پافلچ کا یوم ولادت تھا۔ اعلیٰحضرت اپنی پوشاک مبارک خلوت خانہ شریف میں سنگھوا رہے تھے۔ اس حقیر کو نگاہِ لطف وکرم سے دیکھا اور بزبان لاطینی گویا ہوئے

"عزیز تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے بھی بزبان لاطینی جواباً عرض کیا۔

"بندے کو کرسٹفر کہتے ہیں۔"

ارشاد فرمایا

"پھر تو ہم تم ہم نام ہوئے۔"

پھر بزبان لاطینی پوچھا

"تم کون ہو؟"

میں نے بھی پھر لاطینی ہی میں اپنا جواب گوش گزار کیا کہ

"یہ حقیر فقیر کینٹر سرکی ساکن قصبہ لیدنسکو کا فرزند ہے۔"

اس کم عمری میں ایسی ذہانت دیکھ کر اور ایسے برجستہ جواب سن کر اعلیٰحضرت گرامی قدر نے میرے لئے دعائے خیر کی اور ارشاد فرمایا کہ اپنے پدر بزرگوار کو خط میں لکھنا کہ ہم اپنی دعاؤں میں انہیں یاد رکھیں گے اور تمہیں اپنی نگاہوں میں رکھیں گے۔ بڑے پادری اور چھوٹے پادری جو اس وقت خلوت خانہ تشریف میں موجود تھے مجھے لاطینی میں گفتگو کرتے دیکھ کر غایت متعجب ہوئے۔ انھوں نے مجھے شاباش دی اور میری طرف سے اطمینان کا اظہار کیا۔ میرے عزیزو میری ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں مگر عالم یہ تھا کہ لاطینی یونانی فرانسیسی سب زبانیں فر فر پڑھتا تھا۔ فلسفہ، ریاضی، قانون و دیگر علوم میں رواں تھا۔ خداوند کریم نے مجھے ایسا حافظہ عطا کیا تھا کہ لوگ عش عش کرتے تھے۔ کوئی تحریر اگر دو بار پڑھ لیتا تو وہ میرے حافظہ میں نقش ہو جاتی تھی۔ میرے اساتذہ میرا حافظہ اور میری ذہانت دیکھ کر ورطۂ حیرت میں غرق تھے۔ انھوں نے میرے حق میں پیشگوئی کی تھی کہ میں فاضل اجل بنوں گا۔ اور دین عیسوی کے فلک پر ماہِ تاباں بن کر چمکوں گا۔ میرا اپنا ارادہ یہ تھا کہ کیف جاکر تحصیل علم کی جائے۔ مگر میرے والدین رضامند نہ ہوئے۔ میرے والد بزرگوار نے یوں فرمایا کہ اے فرزند پڑھنے لکھنے کے لئے تو عمر پڑی ہے مگر تمہارے علم سے ہمیں کب فیض پہنچے گا۔ والد ماجد سے ایسے کلمات سن کر میں نے کتابوں کو سلام کیا اور اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے تیار ہوا۔ خیر میں عالم بننے سے تو رہ گیا مگر میں نے والدین کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں ان کے بڑھاپے کا سہارا بنا اور ساتھ عزت کے انہیں دفن کیا۔ اطاعت والدین کا درجہ عبادات سے بھی زیادہ ہے۔"

"پادری صاحب، اب تو پڑھا لکھا آپ کو کیا یاد ہوگا۔" کزمشوف نے یوں ہی

پوچھ لیا۔

"یاد رکھ بھی کیسے سکتا تھا۔ ویسے خداوند کے فضل و کرم سے اب میں اسّی کے پیٹے میں ہوں پھر بھی فلسفہ اور علم بلاغت مجھے اچھا خاصا یاد ہے۔ ہاں زبانیں اور علم ریاضی میں بالکل بھول چکا ہوں۔"

پادری کرسٹفر نے آنکھیں مچکائیں، تھوڑا تامل کیا۔ پھر دبی زبان میں کہا

"ہستی کا مطلب کیا ہے یہی کہ قائم بالذات ہو اور اپنی تکمیل کے لئے کسی اور شے کی محتاج نہ ہو۔"

سر کو تھوڑا ایک طرف کیا تھوڑا تبسم کیا

"روحانی غذا۔"

کہنے لگے

"حقیقت الامر یہ ہے کہ مادی غذا جسم کو توانائی بخشتی ہے روحانی غذا ذہن کو توانا بناتی ہے۔

"سارے سبق ایک طرف اور یہ سبق ایک طرف"، کز مشوف نے ٹھنڈی سانس لیا "اور اگر ورلموف صاحب تک ہم پہنچ نہ پائے تو ہمیں وہ سبق ملے گا کہ یاد رکھیں گے۔"

"آدمی کوئی سوئی تو ہوتا نہیں۔ ہم اس شخص کو ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ اسے جانا کہاں ہے۔ یہیں کہیں چکر لگا رہا ہوگا۔"

وہی لمبی چونچوں والی تینوں چڑیاں اڑتی ہوئی آئیں اور نرسل کے جھنڈوں پر منڈلانے لگیں۔ اپنی ٹرٹراہٹ سے وہ گویا جتا رہی تھیں کہ اپنے چشمہ سے بچھڑنا ان پر کتنا شاق گزر رہا ہے۔ گھوڑے بڑے انہماک کے ساتھ گھاس چر رہے تھے اور بیچ بیچ میں ہنہناتے جاتے تھے۔ دینسکی اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔ وہ گویا یہ جتانا چاہتا تھا کہ یہ حضرات جو انڈے

سموسے اور کھیرے ککڑی سے شوق فرما رہے ہیں ان کی طرف اس کا کوئی دھیان نہیں ہے اس طرف سے بے نیاز ہو کر اس نے مکھیوں مچھروں کو کہ گھوڑوں کی پیٹھ اور پیٹ پر آن آن بیٹھتے تھے۔ مارنا شروع کر دیا۔ کس بیدردی سے وہ انہیں مار رہا تھا۔ اگر کسی مکھی یا مچھر کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو خوشی سے بغلیں بجاتا۔ شکار بچ کر نکل جاتا تو غصے میں بھنبھناتا۔ موت کی زد سے نکل جانے والی مکھی کا آنکھوں ہی آنکھوں میں تعاقب کرتا۔

"وینسکی، تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ یہاں آؤ، تھوڑا کھا پی لو۔"

کز مشوف نے ایک لمبی ڈکار لی جس کا مطلب صاف تھا کہ وہ تو سیر ہو چکے ہیں۔

وینسکی جھجکتے جھجکتے چٹائی کے قریب آیا۔ اس نے کھیرے کے چار بڑے بڑے قتلے یہ دیکھ کر کہ وہ تازہ ہیں اپنے لئے چن لئے۔ دو ابلے ہوئے انڈے کہ کسی قدر میلے اور چٹخے ہوئے تھے اپنی طرف سرکائے۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے پیٹیز کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس طرح جیسے ڈر رہا ہے کہ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک نہ دیا جائے ایک پیٹی کو انگلی کی پور سے آہستہ سے چھوا۔

"ہاں ہاں لے لو" کز مشوف نے اسے حوصلہ دلایا۔

اب وینسکی نے پیٹی کو اعتماد سے اٹھایا اور چٹائی سے دور ہٹ کر ایک طرف ہو کر زمین پہ بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ ٹم ٹم کی طرف تھی۔ نوالہ منہ میں ڈالا اور سڑاپ سے نگل گیا۔ اس سے ایسی آواز پیدا ہوئی کہ گھوڑے بھی چونک پڑے اور انہوں نے ٹک بھری نظروں سے وینسکی کو دیکھا کہ خیریت تو ہے۔

کز مشوف صاحب سیر ہو چکے تھے۔ اب انہوں نے ٹم ٹم میں سے ایک تھیلا قسم کی کوئی چیز نکالی اور سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ ایگور تسکا سے کہا کہ

"دیکھو میں سونے لگا ہوں ساس تھیلے کا دھیان رکھنا کہ کوئی میرے سرہانے سے نکال نہ لے۔"

پادری کرسٹفر نے اپنا لبادہ اپنی پیٹی اپنی کفتان اتار کر الگ رکھی۔ ایگورشکا کو انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا سخت حیران ہوا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ پادری لوگ پائجامہ بھی پہنتے ہیں۔ لیکن پادری کرسٹفر تو فل بوٹ کے ساتھ ساتھ کتان کا پائجامہ بھی پہنے ہوئے تھے۔ ساتھ میں انہوں نے دھاری دار کتان کی بنی ہوئی جیکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ پادری صاحب اپنے گیسوؤں اور ڈاڑھی کے ساتھ اس لباس میں ایگورشکا کو اتنے عجیب و غریب نظر آئے کہ اسے وہ بالکل رابنسن کروسو دکھائی دے رہے تھے۔ کپڑے اتار کر پادری کرسٹفر اور کزمشوف ٹم ٹم کے سائے میں برابر برابر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے لیٹ گئے۔ اور دونوں نے آنکھیں موند لیں۔ دنیسکی نے بھی کھا پی کر لوٹ لگائی۔ دھوپ ہی میں پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ اس نے بھی آنکھیں موند لیں۔

"دیکھیو، کوئی گھوڑوں کو لے کر چمپت نہ ہو جائے" اس نے ایگورشکا نے اتنا کہا اور فوراً ہی سو گیا۔

سب آوازیں موقوف اب خاموشی کا ڈیرا تھا۔ ہاں گھوڑوں کی جگالی یا بیچ بیچ میں ان کا نتھنوں سے ایک شور کے ساتھ سانس لینا۔ یا پھر سونے والوں کے خراٹے۔ کہیں دور سے آتی ہوئی چٹکیری چڑیا کی پکار۔ کبھی کبھی ان لمبی چونچوں والی تین چڑیوں کی ٹڑٹڑاہٹ سنائی دے جاتی جو ایک دفعہ پھر یہ دیکھنے کے لئے پلٹ آئی تھیں کہ یہ زبردستی کے مہمان ٹلے یا نہیں ٹلے۔ چشمہ دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا موجیں اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ لیکن ان ساری آوازوں سے نہ تو خاموشی کا طلسم ٹوٹا نہ ہوا میں کوئی تموج پیدا ہوا۔ اس کے بالکل الٹ ان آوازوں سے اور غنودگی طاری ہوتی چلی گئی۔

گرمی اب کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ایگورشکا اس گرمی سے پریشان ہو کر نرسل کے جھنڈوں کی طرف نکل گیا۔ اس مقام سے اس نے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ویسا ہی دکھائی دیا جیسا دوپہر تک دکھائی دیتا رہا تھا۔ وہی میدان، وہی ٹیلے، وہی

اودے اودے دھندلکوں میں گم فاصلے۔ بس ایک فرق دکھائی دیا۔ ٹیلے اب قریب لگ رہے تھے اور یون چکی ندارد تھی۔ وہ کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اس چٹانی ٹیلے کے پرے جس سے چشمہ پھوٹا تھا ایک اور ٹیلہ دکھائی دے رہا تھا اور یہ ٹیلہ زیادہ چوڑا اور زیادہ ہموار لگتا تھا۔ اس سے جڑا ہوا ایک گاؤں نظر آ رہا تھا کہ بس پانچ چھ گھر اس کی کائنات تھے۔ وہاں زندگی کے تو کوئی اثر آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے اور نہ درخت نہ سایہ۔ لگتا تھا کہ یہ غریب چھوٹا سا گاؤں جلتی دھوپ میں کمہلا کر رہ گیا ہے

ایگورشکا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے کیا۔ اس نے گھاس میں رینگتے ایک ٹڈے کو پکڑ کر ہتھیلی پہ رکھا اور ہتھیلی کے قریب کان لگا کر اس کی بھنبھناہٹ سننی شروع کر دی۔ اپنی ٹانگیں ہلا ہلا کر وہ ایسے بھن بھن کر رہا تھا جیسے سارنگی بجا رہا ہو۔ دیر تک وہ اس موسیقی کو سنتا رہا۔ جب اس سے اکتا گیا تو پھر اس نے ان زرد زرد تتلیوں کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا جو نرسل کے جھنڈوں میں پھر پھر پھر اڑتی پھر رہی تھیں۔ اسے مطلق احساس نہ ہوا کہ وہ واپس ٹم ٹم کی طرف جا رہا ہے۔ اس کے ماموں اور پادری کرسٹفر دونوں گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے۔ انہیں شاید دو تین گھنٹے تک سوئے رہنا تھا۔ گھوڑوں کو بھی تو آخر آرام کرنا تھا۔ تازہ دم ہونے کے لئے انہیں دو تین گھنٹوں کی ضرورت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنا لمبا وقت وہ کیسے گزارے اور گرمی سے بھاگ کر کہاں جائے۔ بڑی مشکل آ پڑی تھی اس نے کیا کیا کہ پیڑ کے تنے سے جو ایک نلکی سی بن گئی تھی اور جس سے پانی ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ اس سے منہ لگا دیا۔ پانی ٹھنڈا ٹھنڈا تھا اور اس سے پیڑ کی چھال کی مہک آ رہی تھی۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ سو اس نے جی بھر کر پانی پیا۔ مگر اس کے بعد بھی وہ منہ لگائے رہا حتی کہ اس کے سارے بدن میں ایک تیز ٹھنڈی لہر دوڑ گئی اور سارا کرتا پانی میں شرابور ہو گیا۔ تب وہ واپس ٹم ٹم کی طرف گیا اور سونے والوں پہ ایک نظر ڈالی۔ اس کے ماموں کے چہرے پہ ابھی تک

وہی کاروباریوں والی خشونت تھی۔ اس کے ماموں اپنے کاروباری قصوں بکھیڑوں میں اتنے غرق رہتے تھے کہ سوتے میں بھی انہیں یہی خواب آتے اور جب گرجا گھر میں وہ عبادت کے لئے جاتے تو یوں ہوتا کہ ادھر حمد گائی جا رہی ہے اور ادھر کاروباری خیالات ان کے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو گھڑی بھر کے لئے بھی فراموش نہیں کر سکتے تھے اور اس گھڑی شاید خواب میں انہیں اون کی گانٹھیں نظر آ رہی تھیں اور گھوڑے اور گاڑیاں، چیزوں کے بھاؤ تاؤ اور ورلموف .... اور ایک پادری کرسٹفر تھے۔ کیا شریف آدمی تھے اور کتنے بے نیاز۔ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ زندگی میں کبھی کاروبار کو اس طرح سر پہ سوار نہیں کیا کہ وہ اکیلا بن کر ان کی روح کو عسوس ڈالے۔ انہوں نے زندگی میں جو مختلف کاروبار کئے ان میں ان کی دلچسپی کاروبار کے اعتبار سے نہیں تھی۔ بلکہ اس اعتبار سے کہ تفریح رہے گی، لوگوں سے ملنا جلنا ہوگا اور جو بھی کاروبار ہو اس میں یہ تو لازماً ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اب جو وہ سفر پہ نکلے تھے تو ان کی دلچسپی اون اور اس کے بھاؤ تاؤ میں اور ورلموف میں اتنی نہیں تھی۔ ان کے لئے تو کشش کا سامان اس میں تھا کہ لمبا سفر ہے، رستے میں خوب باتیں ہوں گی، ٹم ٹم کو کہیں رکوایا اور اس کے سائے میں پڑ کر سو رہے، وقت بے وقت مزے سے کھائیں پئیں گے، .... اور اس وقت ان کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اعلحضرت کرسٹفر کو خواب میں دیکھ رہے ہیں، ان کی زوجہ محترمہ کو، ان کے ساتھ اپنا طالبینی مکالمہ، اور اچھی اچھی کھانے کی چیزیں، غرض وہ ساری چیزیں اس وقت انہیں خواب میں دکھائی دے رہی ہیں جن کا کرمشوف صاحب تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ایگورشکا کی نظریں سونے والوں کے چہرے پر جمی تھیں کہ اچانک دھیمے دھیمے گیت کی آواز اس کے کان میں پڑی۔ کہیں بہت دور کوئی عورت گیت گا رہی تھی۔ لیکن کہاں اور کس سمت میں، یہ اندازہ لگانا دشوار تھا۔ عجب گیت تھا، نرم لطیف

اور اداس، ہلکی ہلکی گریہ کی کیفیت۔ ابھی دائیں سے آواز آرہی تھی اور اب بائیں سے آرہی ہے۔ ابھی گیت فضا میں گونج رہا تھا اور ابھی زمین سے لہرا ٹھنے لگی۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی ان دیکھی روح اس نواح میں بھٹکتی پھر رہی ہے اور نغمہ سرا ہے۔ ایگور شکا نے اردگرد نظر دوڑائی مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ عجیب سی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ پھر جب اس نے کان لگا کر یکسوئی سے سنا تو اسے یوں لگا کہ میدان میں پھیلی گھاس گنگنا رہی ہے۔ پژمردگی کے عالم میں وہ ایک اداس راگ کہ لفظوں سے بے نیاز ہے الاپتی ہے اور اپنی بپتا سناتی ہے کہ میں بے قصور تھی۔ سورج نے مجھ پہ ظلم ڈھایا اور مجھے جھلسا کر رکھ دیا۔ فریاد کرتی ہے کہ بس جینے کے لئے تڑپتی ہوں۔ جوانی میرے اندر ہنوز کروٹیں لے رہی ہے۔ اگر گرمی اور خشک سالی نے مجھے ستایا نہ ہوتا تو میں اس وقت لہلہا رہی ہوتی۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں پھر بھی وہ جانے کس کے حضور گڑگڑا رہی ہے کہ اے کرم کرنے والے مجھ پہ کرم کر۔

ایگور شکا کچھ دیر کان لگا کر سنتا رہا۔ پھر اسے لگا کہ اس کومل اداس گیت کے اثر سے فضا کچھ زیادہ گرم ہو گئی ہے اور کچھ زیادہ سکوت چھا گیا ہے۔ اس گیت کا توڑ وہ یہ لایا کہ اس نے خود گنگنانا شروع کر دیا اور پاؤں سے تھاپ دینے لگا۔ پھر واپس نرسل کے جھنڈوں کی طرف ہو لیا۔ وہاں سے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اب اس پر کھلا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی کے سب سے قریب والے جھونپڑے کے برابر ایک دہقان عورت کھڑی تھی۔ لباس کے نام بس چھوٹے کپڑے، انگیا، پیٹی کوٹ لمبی لمبی ٹانگیں جیسے بگلے کی ہوتی ہیں۔ اسی حساب سے پیر بھی بڑے بڑے۔ بالوں میں ایک ذرا چاندی چمکنے لگی تھی۔ اس کی آستین میں سے سفید سفید برادہ جیسی کوئی چیز گر رہی تھی اور ڈھلوان پہ پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کچھ لوائی کر رہی تھی۔ اب کھلا کہ یہ عورت تھی جو گا رہی تھی اس سے دو ڈھائی گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا لڑکا کھڑا تھا، ننگے سر، لباس کے نام خالی ایک قمیص۔ وہ چپ چاپ کھڑا تھا جیسے نغمہ کے سحر میں کھویا ہوا ہو۔

نیچے کسی شے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہا تھا۔ شاید ایگور تُشکا کی لال قمیص کو۔

گیت ختم چکا تھا۔ ایگور تُشکا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ٹُم ٹُم کی طرف چلا اور کچھ تو کرنے کو تھا نہیں، اس نے پھر پانی کی دھارے سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اداس گیت پھر شروع ہو گیا۔ وہی لمبی ٹانگوں والی عورت گا رہی تھی۔ ایگور تُشکا پر اچانک پھر وہی اکتاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ پانی کی دھار کو اس کے حال پر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اوپر دیکھنے لگا۔
اب جو کچھ اس نے دیکھا وہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ ڈر گیا۔ اوپر بلندی پر ایک ٹیڑھی میڑھی چٹان پر ایک پھولے پھولے چہرے والا چھوٹا سا لڑکا کھڑا تھا، تو ند نکلی ہوئی، تپلی پتلی چھوٹی ٹانگیں، خالی ایک قمیص پہنے ہوئے۔ یہ وہی لڑکا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے دہقان عورت کے قریب کھڑا تھا۔ اس پہ ایک سکتہ طاری تھا۔ آنکھوں میں حیرانی اور تھوڑا خوف جیسے دوسری دنیا سے آئی ہوئی کسی روح کو دیکھا ہو۔ ایگور تُشکا کی لال قمیص کو اور ٹُم ٹُم کو تکے چلا رہا تھا۔ حیرانی سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ قمیص کی سرخ رنگت میں وہ ایک عجب کشش محسوس کر رہا تھا۔ اور ٹُم ٹُم کو اور ٹُم ٹُم کے سائے میں سوتے آدمیوں کو دیکھ کر اس کے یہاں ایک تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے۔ اسے یہ احساس ہی نہ ہو کہ سرخ رنگ کتنا خوشگوار ہوتا ہے اور ایک تجسس کے عالم میں گاؤں سے نکل کر اس طرف کھنچا چلا آ رہا ہو۔ اور شاید اس وقت وہ اپنی بے باکی پر حیران ہو رہا تھا۔ دیر تک ایگور تُشکا اسے اور وہ ایگور تُشکا کو تکتا رہا۔ دونوں چپ رہے اور شاید دونوں ہی کو تھوڑی بیکلی کا احساس ہو رہا تھا۔ دیر تک چپ رہنے کے بعد بالآخر ایگور تُشکا نے سوال کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

اس اجنبی لڑکے کے گال اور پھول گئے۔ وہ چٹان سے بالکل لگ گیا، آنکھیں پھاڑ کے دیکھا، لبوں کو ہلایا اور دبی سی آواز میں جواب دیا "ٹِٹ"

اس کے سوا دونوں نے ایک دوسرے سے اور کوئی بات نہیں کی۔ اجنبی پُراسرار ٹِٹ

اسی طرح چپ سادھے رہا اور اسی طرح یوگورشکا پہ نظریں جمائے رہا۔ اسی حالت میں اس نے اپنی ٹانگ سیدھی کی، اپنی ایڑی سے کسی سہارے کو ٹٹولا اور اوپر کی طرف کھسکتا کھسکتا چٹان پہ چڑھ گیا۔ اوپر چڑھ کر وہ پیچھے کی طرف ہٹتا گیا مگر ایگورشکا پر نظریں اسی طرح جمائے رہا جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر اس نے نظریں ہٹائیں اور لوپ امڑ گیا تو وہ لپک کر آئے گا اور اس کی پیٹھ پہ سکار سیار کرے گا۔ پھر وہ دوسری چٹان پہ چڑھ گیا بس اسی طرح ایک چٹان سے دوسری چٹان پر اور دوسری چٹان سے تیسری چٹان پہ چڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچتے پہنچتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ایگورشکا نے آنکھوں آنکھوں میں جہاں تک اس کا پیچھا کر سکتا تھا اس کا پیچھا کیا۔ پھر وہ دہرا ہو کر اپنے گھٹنے سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ سورج کی تیز کرنوں سے اس کا سر، گردن اور پیٹھ جلنے لگی۔ اداس گیت ساکت فضائیں گونجتا گونجتا پھر تھم گیا۔ چشمہ ایک یکسانیت کے ساتھ سرگوشیاں کرتا بہتا چلا جا رہا تھا۔ گھوڑے گھاس کھائے چلے جا رہے تھے اور ساعتیں تھیں کہ ان کا کوئی انت ہی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جیسے وہ منجمد ہو گئی ہوں ایک مقام پر آ کر ٹھٹھک گئی ہوں۔ لگتا تھا کہ صبح سے اب تک کے عرصے میں ایک صدی گزر گئی ہے ...... کیا اللہ تعالےٰ کی یہ مرضی ہے کہ ایگورشکا، ٹم ٹم اور گھوڑے اس فضا میں ڈھیر ہو جائیں، ان ٹیلوں کی طرح پتھر ہو جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہیں۔

ایگورشکا نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور دھندلاتی نظروں سے اپنی سیدھ میں دیکھا۔ اودے اودے دھندلکوں میں گم فاصلے کہ اب تک ساکت و جامد تھے اب ڈولتے دکھائی دے رہے تھے جیسے آسمان کے ساتھ ساتھ کہیں آگے کی طرف رواں ہوں۔ کوئی خاموش طاقت انہیں کھینچے لئے جا رہی تھی اور گرمی اور وہ رینگتا گیت دونوں ان کے تعاقب میں تھے۔ ایگورشکا کا سر ڈھلک گیا اور آنکھیں مندتی چلی گئیں ....

سب سے پہلے وینسکی کی آنکھ کھلی۔ اسے ضرور کسی چیز نے کاٹا تھا کہ وہ تیزی سے اچھل

کر اُٹھ بیٹھا، اپنا شانہ کھجایا اور بڑبڑانے لگا۔

" خدا کی پھٹکار پڑے ان پر۔ ستیاناس ہو ان کا۔"

پھر چشمہ پر جا کر اس نے تھوڑا پانی پیا اور دیر تک ہاتھ منہ دھوتا رہا۔ اس کے غراروں کلیوں کے شور سے ایگورشکا کی آنکھ کھل گئی۔ دینیسکی کے بھیگے چہرے پر پانی کی بوندیں دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے یہ سنگ مرمر کا چہرہ ہو۔ پوچھنے لگا

" ہم جلدی چل رہے ہیں نا؟"

دینیسکی نے سورج کی طرف دیکھا کہ کتنی بلندی پر ہے پھر بولا

" ابھی چل رہے ہیں۔"

اس نے کرتے کے کنارے سے ہاتھ منہ کو پونچھا۔ پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ ایک ٹانگ پہ کھڑا ہو گیا۔

" چلو چلیں۔ دیکھیں نرسل کے جھنڈوں میں پہلے کون پہنچتا ہے۔"

گرمی سے ایگورشکا کا پلپلا ہو گیا تھا۔ ابھی تک آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ آدھا سو رہا تھا آدھا جاگ رہا تھا۔ پھر بھی وہ دینیسکی کے ساتھ دوڑ لگانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دینیسکی کی اچھی خاصی عمر ہو گئی تھی۔ بیس سے نکل چکا تھا۔ ماشاءاللہ کو جوانی کر رہا تھا خیر سے شادی بھی ہونے والی تھی۔ لیکن ابھی تک وہی لڑکوں والے لچھن تھے۔ پتنگ اڑانا، کبوتروں کے پیچھے دوڑتے پھرنا، اٹکن ٹپکن کھیلنا، دوڑ بدنا، اب تک اس کے یہی شغل اشغال چلے آ رہے تھے۔ بچوں کو جہاں کھیلتے یا لڑتے جھگڑتے دیکھا بیچ میں کود پڑا۔ پھر جو ان کا حال وہ اس کا حال۔ مالک جہاں ادھر اُدھر ہوا یا سویا ادھر اس نے اسی قسم کا کوئی شغل شروع کر دیا۔ مثلاً یہ کہ ایک ٹانگ پہ کھڑے ہو کر اچھلنا شروع کر دیا یا روڑے پھینکنے شروع کر دیئے۔ بچوں میں جس طرح وہ بالکل بچہ بن جاتا اور جس انہماک سے طفلانہ حرکتیں کرتا اسے دیکھ کر بڑے تعجب کرتے اور بے ساختہ کہتے کہ یہ عجب کھلنڈرا ہے۔ مگر بچوں کو

مطلق احساس نہ ہوتا کہ ان کے حلقہ میں کوئی بڑی عمر والا گھس آیا ہے اور ان کے کھیل میں کھنڈت ڈال رہا ہے وہ سوچتے کہ ہمارا کیا لیتا ہے کھیل رہا ہے تو کھیلے۔ بس ہم سے لڑے بھڑے نہیں۔ بالکل اسی طرح کی صورت تھی جیسے کوئی بڑا سا کتا اپنے بھولپن میں پلّوں کے درمیان آن کودے اور ان کے ساتھ کلیلیں کرنا شروع کردے۔

دنیسکی نے ایگورشکا کو ہرا دیا اور ہرا کر خوب بغلیں بجائیں۔ اس نے اسے آنکھ ماری اور یہ جتلانے کے چکر میں کہ وہ ایک ٹانگ پر جتنی دور چاہے جا سکتا ہے یہ شرط پیش کی کہ آؤ ایک ٹانگ پر اچھلتے ہوئے سڑک کے اس کنارے تک جاتے ہیں اور دم لیے بنا واپس آتے ہیں۔ ایگورشکا نے یہ شرط نہیں مانی۔ اصل میں وہ بہت تھک گیا تھا۔ غریب کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

دنیسکی ایک دم سے سخت سنجیدہ ہو گیا۔ اتنا سنجیدہ تو وہ اس وقت بھی نہیں ہوتا تھا جب کز مشوف صاحب اسے سخت ڈانٹ بتلاتے اور دھمکی دیتے کہ چھڑی سے تیری کھال ادھیڑ دوں گا۔

وہ چپکے چپکے گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔ چہرہ سخت تنا ہوا بالکل اس طرح جس طرح کوئی شخص ملحدانہ باتیں سنے اور تن جائے۔ ایک نقطہ پر جا کر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ ایک ہاتھ اٹھایا اور مٹھی کھول کر پیالہ کی سی شکل بنائی اور اچانک پیٹ کے بل گر کر ہاتھ گھاس پہ مارا "پکڑ لیا"۔ فتحمندانہ ایک چیخ ماری اور ایک بڑے سے ٹڈے کو ہاتھ میں اٹھا کر کھڑا ہوا اور ایگورشکا کو دکھانے لگا۔

دونوں نے آہستہ آہستہ ٹڈے کی پیٹھ پر انگلیاں پھیریں اور دھیرے سے اس کی مونچھ جیسے کھڑے دونوں بالوں کو چھوا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح ٹڈا خوش ہو جائے گا۔ پھر دنیسکی نے ایک موٹی سی مکھی پکڑی اور ٹڈے کے آگے کر دی۔ ٹڈے نے جبڑا کھولا جو بالکل ایسا تھا جیسے کسی خود کا کوئی سوراخ ہو۔ ٹڈے کے انداز میں بڑا

بے اعتنائی تھی۔ جیسے ونیسکی سے اس کی پرانی آشنائی ہو۔ اس نے مکھی کے پیٹ کو اک ذرا کترا۔ انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ پھدکا، اس کے گلابی دھاری دار پر کھلے اور وہ اڑ کر گھاس میں جا بیٹھا۔ پھر فوراً ہی اس نے چیں چیں شروع کر دی۔ پھر انہوں نے مکھی کو بھی چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے چھوٹے پر پھڑپھڑائے اور اپنے پیٹ کسے بغیر ہی جس سے وہ محروم ہو چکی تھی اڑ کر گھوڑوں کی طرف چلی۔

ٹم ٹم کے پیچھے کسی نے لمبا سانس لیا۔ یہ کزمشوف صاحب تھے۔ کہ اب جاگ اٹھے تھے۔ انہوں نے بڑی عجلت میں گردن اٹھا کر گھبرائی نظروں سے ادھر ادھر دور تک دیکھا۔ ان نظروں نے ایگور شکا اور ونیسکی کو تو سرے سے فراموش ہی کر دیا۔ یہ نظریں چغلی کھا رہی تھیں کہ جاگتے پر اس شخص کو صرف دو چیزوں کا دھیان ستا رہا ہے، اون کا اور ورلموف کا۔

"پادری صاحب۔ اُٹھئے۔ وقت ہو گیا ہے"

انہوں نے گھبرائے لہجہ میں کہا۔

"آپ یہاں سوتے رہ جائیں گے اور ادھر سارا کاروبار ہاتھ سے نکل جائے گا .... ونیسکی ٹم ٹم کو جلدی سے جوت لے"

پادری کرسٹفر جس طرح ہنستے مسکراتے سوئے تھے اسی طرح ہنستے مسکراتے بیدار ہوئے چہرے پہ کچھ لکیریں کچھ جھریاں سی پڑ گئی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ چہرہ سکڑ کر پہلے سے آدھا رہ گیا ہے۔ منہ ہاتھ دھونے کپڑے بدلنے کے بعد انہوں نے جیب سے ایک میلی کچیلی چھوٹی سی زبور نکالی اور مشرق کی طرف منہ کر کے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ ساتھ میں سینے پہ دونوں ہاتھوں سے صلیب، بناتے جاتے تھے۔

"پادری صاحب"

کزمشوف نے کسی قدر ملامت کے لہجہ میں کہا

"یہ چلنے کا وقت ہے۔ گھوڑے جت چکے ہیں اور آپ ہیں کہ ..... خدا

کے لئے۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں، بس ابھی چلتے ہیں"

پادری کرسٹفر نے دھیرے سے کہا

"بس ذرا زبور شریف کی تلاوت کرلیں۔۔۔۔۔ وہ آج میں نے ابھی تک نہیں کی ہے"

"قبلہ، زبور شریف کی تلاوت بعد میں کی جا سکتی ہے"

"بھائی ایوان ایوینچ، یہ میرا روزانہ کا ورد ہے۔ اسے میں قضا نہیں کر سکتا"

"اللہ میاں آپ سے اس کا حساب تو نہیں لیں گے"

کرسٹفر پادری کوئی پاؤ گھنٹے تک مشرق کی طرف منہ کئے کھڑے رہے اور لب ان کے ہلتے رہے۔ ادھر کزمشوف صاحب کا یہ حال تھا کہ سخت بیزاری سے انہیں دیکھ رہے تھے اور بے چینی سے کاندھے مچکارہے تھے۔ خاص طور پر غصہ انہیں اس وقت آتا جب پادری صاحب ہر حمد کے بعد ایک لمبا سانس لیتے، سینے پر صلیب بناتے اور اس خیال سے بناتے کہ دوسرے بھی اسی طرح صلیب بنائیں اور با آواز بلند تین بار ورد کرتے

"خداوندا، خداوندا، خداوندا۔ بے شک سب تعریفیں اسی پاک پروردگار کے لئے ہیں"

آخر کے تئیں پادری صاحب نے تبسم فرمایا۔ آسمان کی طرف نگاہ کی۔ زبور شریف کو جیب میں رکھا اور بولے

"ختم"

فوراً ہی ٹم ٹم چل پڑی۔ ویسے لگ یہ رہا تھا کہ مسافر آگے نہیں جا رہے، پیچھے لوٹ رہے ہیں۔ زمین کا سارا منظر وہی تھا جو دوپہر کو دیکھا تھا۔ ٹیلے اسی طرح اودی اودی دوریوں میں گھلے ملے نظر آرہے تھے۔ کچھ دکھائی نہیں پڑتا تھا کہ یہ کہاں جا کر ختم ہوتے

ہیں۔ گھاس کے قطعے، روڑے پتھر، کٹے اناج کے گٹھر کتنی تیزی سے یہ جھلک دکھاتے جاتے اور نظروں سے اوجھل ہوتے جاتے اور وہی پہاڑی کوے۔ اور اسی طرح ایک چیل آہستہ آہستہ بازو ہلاتی فضا میں تیرتی ہوئی۔ گرمی اور خاموشی کے اثر سے فضا میں اور زیادہ جمود کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ غریب فطرت جیسے تھک کر بے سدھ پڑی ہو۔ نہ کوئی ہوا کا جھونکا، نہ کوئی چہکار، نہ کوئی بادل کا ٹکڑا۔ لیکن خدا خدا کرکے بالآخر اب جب کہ سورج مغرب میں ڈوبنے لگا تھا تو یہ گھاس بھرا میدان، یہ پہاڑیاں اور یہ فضا کسی میں بھی دباؤ کو سہارنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ پیمانۂ صبر چھلکنے لگا تھا۔ ایک کسمساہٹ پیدا ہوئی۔ پہاڑیوں سے پرے اچانک ایک گرد کا بادل اٹھا۔ اُٹھتے اُٹھتے پھیلے میدان کو اشارہ کیا کہ اچھا تو میں آنے لگا ہوں۔ اور وہ امنڈتا دکھائی دیا۔ جامد فضا میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی۔ ایک آندھی اُٹھی۔ شور کرتی سنسناتی پورے میدان میں چلنے لگی۔ اچانک گھاس کی یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے اس کے بیچ سرگوشیاں شروع ہوگئی ہوں۔ سڑک کی طرف سے ایک بگولا اٹھا اور خس و خاشاک کو بکھرے پروں کو کھیوں کو سمیٹتا ہوا پورے میدان میں دوڑتا چلا گیا۔ پھر یہ بل کھاتا چکر کھاتا ستون آسمان کی طرف بلند ہوتا چلا گیا اور سورج پہ چھا گیا۔ پٹ سن کے کتنے گچھے پورے میدان میں یہاں وہاں سرکتے گردش کرتے نظر آرہے تھے۔ ایک گچھا چکر کھاتا ہوا کی زد میں آگیا۔ اس کے بیچ پھنس کر وہ اس طرح تڑا مڑا کہ چڑیا کی شکل بن گیا۔ آسمان کی طرف اڑا۔ اونچا اُٹھتے اُٹھتے وہ ایک کالا سا دھبا بن گیا، پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ پھر ایک اور گچھا چکراتی ہوا میں پھنس گیا پھر ایک اور۔ پھر ایک اور۔ اور ایگورشکا نے دیکھا کہ سن کے دو گچھے ہوا میں اڑتے ہوئے بار بار ایک دوسرے سے اس طرح الجھتے ٹکراتے ہیں اور گتھم گتھا ہو جاتے ہیں جیسے کشتی لڑ رہے ہوں۔

سڑک کی سمت سے ایک تلہور پھڑ پھڑا کر اڑی۔ جب اس نے چمکتی دھوپ میں

پر پھیلائے اور دم کو سیدھا کیا تو یوں لگا جیسے کسی بنسی والے کی ٹین کی بنی مچھلی ہو، یا کسی جوہڑ پہ منڈلاتی ہوئی بھنبھیری ہو کہ جب وہ پانی پہ پھر پھر چکر کاٹ رہی ہوتی ہے تو اس کے پر اس کے اینٹینا کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف اینٹینا اگ آئے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی چمکتا جھلملاتا کپڑا ہوا میں لہرا رہا ہو تلھورنے پہلے بالکل سیدھی بلندیوں میں پرواز کی ——
لیکن پھر شاید گرد کے بادل سے خوفزدہ ہو کر اس نے سمت بدلی اور ایک طرف کو ہولی اگرچہ اس کے پروں کی جھلملاہٹ دیر تک دکھائی دیتی رہی۔

پھر آندھی سے بدحواس ہو کر کورن کیر یک نام کی ایک چڑیا گھاس سے نکلی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ چکر کیا ہے۔ اس نے عقلمندی یہ کی کہ ہوا کے رخ پر اڑنا شروع کر دیا۔ ایک وہ احمق پرندے ہوتے ہیں کہ ہوا کے رخ کے خلاف اڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے سارے پر تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ تو ہوا کے رخ اڑتے ہوئے وہ ایسی نظر آئی جیسے پھولتی جا رہی ہو اور پھول کر تیتر کے برابر ہو گئی ہو۔ لگتا تھا کہ اسے بہت تاؤ آیا ہوا ہے اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھ رہی ہے۔ ہاں پہاڑی کوے جو اسی سبزہ زار میں پلے بڑھے تھے اور یہاں کے موسمی نشیب و فراز سے خوب آشنا تھے اپنے اسی اطمینان و سکون کے ساتھ سبزے پہ منڈلاتے رہے یا دھیرج کے ساتھ زمین پہ اتر آتے اور باقی باتوں سے بے تعلق یکسوئی سے سخت زمین کو اپنی چونچوں سے کریدنا شروع کر دیتے۔

ٹیلوں کے پرلی طرف سے بجلی کی کڑک سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ ڈینسکی نے مستی میں آ کر منہ سے سیٹی بجانی شروع کر دی اور گھوڑوں کو چابک مار کر سرپٹ دوڑانے لگا۔ کرسٹفر بادری اور کزمشوف نے اپنے اپنے ہیٹ سنبھالے اور ٹیلوں کی سمت میں نظر دوڑائی ...... مینہ پڑنے لگے تو مزہ آ جائے۔ لگتا تھا کہ بس ایک اشارے کی دیر ہے۔ پھر یہ سٹیپی پہ پورا قطعہ ارض نہال ہو جائے گا۔ مگر کسی ان دیکھی

ظالم طاقت نے آہستہ آہستہ آندھی کو زنجیر پہنائی، ہوا کو باندھا، اڑتی گرد کو آسودۂ زمین کیا۔ اور ایک مرتبہ پھر چاروں طرف خاموشی کا دور دورہ تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بادل جانے کہاں جا چھپا۔ دھوپ سے پتے ٹیلوں پر دراڑیں دکھائی دینے لگیں جیسے جھریاں پڑ گئی ہوں۔ فضا پہ پھر جمود طاری ہو گیا۔ بس کچھ چڑیاں کہ بے آرام ہو گئی تھیں اپنی تقدیر سے نشاکی نظر آتی تھیں.......... اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دن کی روشنی رخصت ہو گئی۔

---

(۳)

شام کے دھندلکے میں ایک بڑا سا ایک منزلہ مکان دکھائی دیا۔ زنگ آلود آہنی چھت، بے چراغ دریچے۔ یہ مکان اپنے تئیں ایک سرائے تھا اور کچھ یوں ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے اس کا ایک احاطہ بھی ہے مگر یہاں احاطہ نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ چٹیل میدان میں اس طرح کھڑا تھا کہ اردگرد کوئی احاطہ کی دیوار کھنچی ہوئی نہیں تھی۔ ایک سمت میں ایک مختصر سا لٹا کھٹا شاہ دانے کا ایک باغ نظر آ رہا تھا اس کے قریب ہی دریچوں کے برابر برابر کچھ سوتے کچھ جاگتے سورج مکھی کے پودے سر نیوڑھائے کھڑے تھے اس مختصر سے باغ میں ایک چکی چل رہی تھی جس کے شور نے خرگوشوں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ باقی وہاں نہ دیکھنے کے لئے کچھ تھا نہ سننے کے لئے، سوائے سٹیپی نام والے پھیلے ہوئے میدان کے۔

ٹم ٹم اس چھوٹی سی پورچ میں جس پر چھت کے نام ایک ترپال پڑی تھی داخل ہوئی تھی کہ مکان کے اندر سے خوشی سے بھرپور آوازیں سنائی دیں۔ ایک کسی مرد کی آواز تھی۔ دوسری زنانہ آواز تھی۔ سوئنگ دروازہ چوں کر کے بولا اور دوسرے ہی لمحہ ایک پختہ عمر والا دراز قد شخص ٹم ٹم کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اور زور زور سے بازو ہلا رہا تھا۔ یہ سرائے کا مالک موسے موسیوچ تھا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ چہرہ پھیکا پھیکا۔ ڈاڑھی خوشنما کالی سیاہ جیسے ہندی روشنائی ہوتی ہے۔ بر میں ایک پھٹا پرانا کالا فراک کوٹ جو اس کے دبلے پتلے شانوں پر ایسے جھول رہا تھا جیسے کسی کھونٹی پہ ٹنگا ہو۔ اور ہر دفعہ جب موسئی موسیوچ خوشی

سے یا کسی اندیشہ سے ہاتھ آپس میں ملا کر مٹھیاں بھینچتا تھا۔ تو اس جھابڑ جھلے کوٹ کا دامن ایسے ہلتا تھا جیسے پرندہ اپنے بازو پھڑپھڑاتا ہے۔ اس فراک کوٹ کے علاوہ سرائے والے نے چوڑے پائنچوں کا ایک سفید پائجامہ پہن رکھا تھا اور ایک مخمل کی واسکٹ جس پر سرخ سرخ پھول بنے ہوئے تھے کہ پھولوں سے زیادہ کھٹملوں کا ان پر گمان ہوتا تھا۔
موسئے موسیوچ نے جب پہچان لیا کہ آنے والے کون لوگ ہیں تو وہ تو خوشی سے پاگل ہو گیا۔ کیسا مٹھیاں بھینچ رہا تھا اور عجیب عجیب آوازیں نکال رہا تھا۔ بریں جھابڑ جھلا فراک کوٹ جھول رہا تھا اور وہ اتنا جھک رہا تھا کہ دہرا ہوا جا رہا تھا اس طرح ہنس رہا تھا کہ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹم ٹم کا نظارہ اس کے لئے فرحت کا سامان بھی رکھتا تھا اور ساتھ میں اس میں کوئی تکلیف کا پہلو بھی تھا۔
"ہائے اللہ۔ یا مرے مولا" کیسا چہچہا رہا تھا۔ سانس اس کا پھولا ہوا تھا۔ ادھر سے ادھر بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ اور وہ وہ حرکتیں کر رہا تھا کہ مسافروں کو ٹم ٹم سے اترنا دشوار ہو گیا۔

"آج تو میرے نصیب کھل گئے۔ ایواں ایوینچ اور کرسٹفر پادری صاحب اور اسے دیکھو۔ آگے کی سیٹ پہ وہ کیسا پیارا سا ننھا سا صاحبزادہ بیٹھا ہے اللہ نے مجھ پہ کیسا کرم کیا ہے۔ مگر میں یہاں کھڑا کیا کر رہا ہوں۔ مہمانوں کو مجھے اندر لے کر جانا چاہیئے۔ جناب اندر تشریف لے چلیے۔ میں آپ سے نیازمندانہ گزارش کرتا ہوں۔ آپ کا آنا سر آنکھوں پر۔ خوش آمدید خوش آمدید۔ ارے صاحب سامان میرے حوالے کیجئے"
موسئے موسیوچ ٹم ٹم میں سامان ٹٹولتے ٹٹولتے اور مہمانوں کو اترنے میں سہارا دیتے دیتے اچانک ہٹوٹا سا مڑا اور بھرائی ہوئی آواز میں پکارا کچھ اس طرح جیسے وہ ڈوب رہا ہو اور کسی کو مدد کے لئے پکار رہا ہو "سلیمان۔ سلیمان"

"ارے سلیمان - او سلیمان"

گھر کے اندر کسی عورت نے موسے موسیوپچ سے اشارہ لے کر اپنے لہجہ میں پکارا۔

دروازہ پھر چوں سے بولا اور ڈیوڑھی میں ایک پستہ قد جوان العمر یہودی نظر آیا۔ لمبی چونچ سی ناک، چاندبیچ میں سے گنجی، گنج کے ارد گرد گاجر کی رنگت کے موٹے گھنگھریالے بال بر میں ایک میلی جیکٹ جیکٹ جس کے دامن گولائی میں ترشے ہوئے تھے اور جس کی آستینیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ سرج کا پاجامہ۔ اس حلیہ کے ساتھ وہ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی دم کٹا پر کٹا پرندہ ہو۔ یہ سلیمان تھا۔ موسے موسیوپچ کا بھائی۔ وہ عجیب سے انداز میں ہنستا ہوا ٹم ٹم کے پاس پہنچا۔ لیکن اس طرح کہ آنے والوں کو نہ سلام نہ دعا۔

"ایوان ایوینچ اور فادر کرسٹفر تشریف لائے ہیں۔"

موسے موسیوپچ نے ایسے لہجہ میں کہا جیسے اسے اندیشہ ہو کر سلیمان اس کے کہے کا اعتبار نہیں کرے گا۔

"واہ بھئی واہ۔ ایسے معزز مہمان اور کیسے اچانک آئے ہیں۔ سلیمان سامان اٹھاؤ مہمان گرامی۔ آپ کے قدم ہماری سر آنکھوں پر۔ اندر تشریف لے چلئے۔"

بس اس کے ذرا بعد کز مشوف صاحب پادری کرسٹفر اور ایگورشکا ایک بڑے سے بے رنگ اداس خالی کمرے میں چیڑ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک پرانی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ یہ میز اکیلی اکیلی دکھائی دے رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ تین کرسیوں اور ایک صوفے کے سوا جس پر پھٹا پرانا امریکی چمڑا چڑھا ہوا تھا اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور کرسیاں ایسی تھیں کہ شاید بھلے مانس انہیں کرسیاں کہنے میں تامل کرتے۔ کرسیوں سے ملتا جلتا یہ فرنیچر بہت ابتر حالت میں تھا۔ ان پر چڑھا ہوا امریکی چمڑا اپنے اچھے دن گزار چکا تھا۔ ہر ایک کی پشت پیچھے کی طرف اتنی جھک گئی تھی کہ اب ان پر بچہ گاڑیوں کا گمان گزرتا تھا۔ اللہ جانے اس نامعلوم بڑھئی نے کیا سوچ کر ان کرسیوں کی پشت کو اتنی بیدردی سے

موڑا تھا۔ یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ اس میں غریب بڑھئی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بس کسی پہلوان قسم کے مہمان نے ان کے ساتھ زور آزمائی کر کے پہلے انہیں پیچھے کی طرف موڑا پھر سیدھا کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کا حلیہ اور بگاڑ دیا۔ کمرے میں ایک بے رنگی کی فضا تھی۔ دیواروں نے دھویا رنگت پکڑ لی تھی۔ چھت اور کنگنیوں پر کالونس بنی ہوئی تھی۔ فرش پر دراڑیں ہی دراڑیں جا بجا گڑھے بن گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ گڑھے کیسے پڑ گئے (سوائے اس کے کہ تصور کر لیا جائے کہ کسی پہلوان صاحب کے سبز قدم کا یہ کرشمہ ہے) اس کمرے کی کیفیت سے لگتا تھا کہ یہاں اگر درجن بھر شمعیں روشن کر کے رکھ دی جائیں تو بھی اندھیرا ہی رہے گا۔ در و دیوار آرائش نام کے تکلف سے بالکل بے نیاز تھے۔ ہاں ایک دیوار پہ لکڑی کے ایک فریم میں دو سروں والا ایک عقاب نظر آ رہا تھا اور اس کے نیچے کچھ ضابطوں کی ایک فہرست آویزاں تھی۔ دوسری دیوار پر اسی طرز کے ایک فریم میں کندہ کاری کی صورت ایک تصویر نظر آ رہی تھی جس کا عنوان تھا "بیگانگیٔ خلق" مگر خلقت کس چیز سے بیگانگی برتتی ہے۔ یہ معلوم کرنا ناممکن تھا کہ کندہ کاری امتداد زمانہ سے بہت دھندلا گئی تھی اور پر سے مکھیوں کی غلاظت نے اسے میلا کر دیا تھا۔ کمرے کے اندر ایک بساندسی پھیلی ہوئی تھی۔

موسٹے موسیوچ جب مہمانوں کو اندر لے جا رہا تھا تو وہ طرح طرح کے منہ بنا رہا تھا۔ طرح طرح سے بل کھا رہا تھا۔ کاندھے چکا رہا تھا۔ مسرت بھری آوازیں نکال رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ان باتوں سے وہ اسے اچھا سمجھیں گے اور خوش ہوں گے۔

"ہماری گاڑیاں ادھر سے کب گزری تھیں؟" کز مشوف نے اس سے پوچھا۔

"ایک پارٹی تو صبح سویرے گزری ہے۔ دوسری پارٹی یہاں کھانے پینے کیلئے رکی اور شام سے پہلے پہلے روانہ ہو گئی۔"

"اچھا ..... ورلوف کے متعلق بتاؤ۔ وہ شخص ادھر سے گزرا یا ابھی

نہیں گزرا۔"

"نہیں جناب۔ ابھی وہ نہیں گزرے۔ کل ان کا ملازم گریگوری ایگورچ ادھر سے ضرور گزرا تھا۔ کہتا تھا کہ اسے آج ملکان کی فارم پر پہنچنا ہے۔"

"خوب۔ تو پہلے ہم سیدھے گاڑیوں کے پیچھے جاتے ہیں۔ انہیں ہم جلدی جا پکڑیں گے۔ اس کے بعد ملکان کی فارم کا رستہ پکڑیں گے۔"

"اللہ رحم کرے۔ ایوان ایوانچ صاحب، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس اندھیری رات میں آپ کہاں جائیں گے۔"

موسے موسیوچ نے گھبرا کر کہا اور اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں دے کر انہیں بھینچا

"نہیں جناب۔ آپ کھانا تناول فرمائیں۔ رات یہاں بسر کریں۔ کل صبح سویرے روانہ ہوں اور جہاں پہنچنا چاہتے ہوں پہنچ جائیں۔"

"نہیں، نہیں۔ وقت نہیں ہے۔ آج تو معاف کر دیں پھر کبھی یہاں آ کر ٹھہریں گے۔ اس وقت ہم بس پندرہ منٹ ٹھہریں گے اس کے بعد چل پڑیں گے۔ ہم ملکان پہنچ کر وہاں رات بسر کر سکتے ہیں۔"

"پندرہ منٹ"، موسے موسیوچ پریشان ہو کر چیخ پڑا۔

"ایواں ایوانچ، خدا کا خوف کریں۔ کان کھول کر سن لیں۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ یہ کروں گا کہ آپ کے ہیٹ کوٹھری میں چھپا دوں گا اور باہر سے تالا ڈال دوں گا۔ کم از کم کچھ تھوڑا بہت کھا تو لیں اور ایک ایک پیالی چائے پی لیں۔"

"کھانے پینے کا بالکل وقت نہیں ہے" کزمشوف نے کہا۔

موسے موسیوچ نے ایک طرف کو سر نیوڑھا لیا۔ گھٹنوں پر جھکا اور ہاتھ کھول کر اس طرح پھیلائے جیسے کوئی اسے مکا مار رہا ہے اور وہ اس سے بچاؤ کر رہا ہے۔ پھر ایک

درد بھری بیٹھی مسکراہٹ کے ساتھ گڑگڑایا۔

" الوان الوپنچ صاحب۔ فادر کرسٹفر۔ اتنا کرم کریں کہ میرے ساتھ چائے پی لیں کیا آپ مجھے اس لائق نہیں سمجھتے کہ میرے ساتھ بیٹھ کر ایک ایک پیالی چائے پی لیں"

" اچھا ٹھیک ہے۔ چائے کی ایک پیالی پیتے چلیں"۔

پادری کرسٹفر نے ایک مشفقانہ تبسم فرمایا:

"اس میں کونسی ایسی دیر لگے گی"

" اچھا خیر"، کزمشوف نے آخر ہتھیار ڈال دیئے۔

موسے موسیوپچ نے خوشی سے نعرہ لگایا اور کاندھے اس طرح جھٹکے جیسے وہ ٹھنڈے پانی سے نکل کر حرارت بھری فضا میں آ گیا ہے۔ پھر دروازے کی طرف لپکا اور اسی طرح بدحواس ہو کر پکارا جس طرح بدحواس ہو کر اس نے سلیمان کو آواز دی گئی۔

" روزا۔ روزا۔ سماوارے کر آ جاؤ"

منٹ بھر بعد دروازہ کھلا سلیمان ایک بڑی سی ٹرے ہاتھوں میں سنبھالے داخل ہوا۔ ٹرے کو میز پر رکھ کر اس نے طنز بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر وہی ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی۔ اب لیمپ کی روشنی میں یہ مسکراہٹ دیکھی بھی جا سکتی تھی۔ بہت نمایاں مسکراہٹ تھی۔ مگر اسی کے ساتھ بہت پیچیدار بھی تھی کتنی مختلف قسم کی جذباتی کیفیات اس میں گڈمڈ تھیں۔ مگر غالب رنگ حقارت کا تھا جو صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت مضحکہ خیز اور احمقانہ سا خیال اس کے دماغ میں چکر لگا رہا ہے۔ ایک حقارت اور ناپسندیدگی کا احساس اسے ستا رہا ہے کچھ سوچ کر خوش ہے کسی مناسب موقع کا منتظر ہے کہ وہ موقع آئے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر ان کا تمسخر کرے اور پھر زور کا قہقہہ لگائے۔

کزمشوف صاحب ایک طنز یہ انداز میں مسکرائے اور بولے

"سلیمان ان گرمیوں میں تم ہماری بستی کے میلہ میں نہیں آئے۔ آجاتے تو یہودیوں والا کوئی چھوٹا موٹا ناٹک دیکھنے کو مل جاتا"

اب سے دو برس پہلے کہ ایگورشکا کو وہ واقعہ اچھی طرح یاد تھا میلہ میں ایک بوتھ پر سلیمان نے یہودیوں کی زندگی کے کچھ مناظر پیش کئے تھے۔ اس کی اداکاری بہت کامیاب رہی تھی۔ کزمشوف کا اشارہ اسی طرف تھا لیکن سلیمان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس نے کزمشوف کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر نکل گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد سموار لے کر واپس آگیا۔

میز پر جو اسے کرنا کرانا تھا وہ کر چکا تو وہ ایک طرف ہٹ کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک پیر تھوڑا آگے سرکا لیا اور طنز بھری نظروں سے پادری کرسٹفر کو دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں ایک اکڑ ایک حقارت کا رنگ تھا اور جیسے مقابلہ کے لئے ڈٹ کر کھڑا ہو۔ مگر اسی کے ساتھ اس کی حالت انتہائی مضحکہ خیز۔ اور قابل رحم بھی نظر آ رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ وہ اپنے انداز سے جتنا رعب گانٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنا ہی اس کا اٹنگا پائجامہ، اس کا ہاب ٹیل کوٹ، اس کی ترچی مڑی ناک، اس کا کلام جیسا قد کاٹھ غرض اس کا سارا بے ڈھنگا پن زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔

موسئے موسیوچ دوسرے کمرے سے ایک سٹول اٹھا لایا اور میز سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ پھر مہمانوں کو خوش کرنے کی نیت سے کہنے لگا۔

"صاحب تکلف مت کیجئے۔ اچھی طرح نوش جان کیجئے۔ آپ کی طبیعت سیر ہوجائے گی۔ ایسے عزیز مہمان تو شاذونادر ہی آتے ہیں۔ فادر کرسٹفر کی زیارت برسوں بعد ہوئی ہے۔ اور ہاں یہ تو بتائیے کہ یہ ننھے میاں کون ہیں"

اس نے پیار بھری نظروں سے ایگورتسکا کو دیکھا۔

"یہ میری بہن اولگا افانوفن کا بیٹا ہے" کرمستوف نے جواب دیا۔

" صاحبزادے کہاں جا رہے ہیں"

" سکول۔ ہم اسے ہائی سکول میں داخل کرانے کے لئے جا رہے ہیں"

موسئے موسیلوچ نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بہت حیرت واستعجاب سے دیکھا اور اپنے سر کو معنی خیز انداز میں جنبش دی۔

" خوب۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے"

اس نے انگلی سے سموار کو ٹھوکتے ہوئے کہا

" بہت اچھی بات ہے۔ ننھے میاں تم ہائی سکول سے پڑھ لکھ کے جنٹلمین بن کے لوٹو گے۔ تمہارا وہ رعب داب ہوگا کہ ہم ہیٹ اتار کر تمہیں سلام کیا کریں گے۔ دولت تمہارے ہاتھ کا میل ہوگی۔ تم دانا بیٹا بنو گے اور وہ شان ہوگی تمہاری کہ تمہاری امی کا جی باغ باغ ہو جائے گا۔ واہ۔ خوب"

موسئے موسیلوچ چپ ہوا، پھر ذرا دیر کے بعد ٹھٹھول کے انداز میں کہنے لگا۔

" فادر کرسٹفر! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں بشپ صاحب کو یہ لکھنے کی سوچ رہا ہوں کہ آپ بیوپاریوں کا کباڑا کرنے لگے ہیں۔ میں سٹامپ کے کاغذ پر یہ لکھ کر بھیجوں گا کہ ہمارے فادر کرسٹفر کا ہاتھ آجکل تنگ ہے اس لئے انہوں نے تجارت شروع کر دی ہے اور اون بیچ رہے ہیں"

" ہاں اس بڑھاپے میں میرے دماغ میں یہ عجب سودا سمایا ہے"

پادری کرسٹفر کہتے کہتے ہنسے

" میں پادری سے بیوپاری بن گیا ہوں۔ بھائی اب میری عمر ہے کہ بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا۔ مگر میں ہوں کہ جیسے فراعنہ رتھوں میں بیٹھ کر گشت کیا کرتے تھے۔

ویسے میں قریہ قریہ گشت کرتا پھرتا ہوں بس دماغ کا خناس ہے۔"

"لیکن فادر، آپ دولت بہت کما لیں گے۔"

"توبہ کرو۔ ہم پیسہ کم کمائیں گے۔ ٹھوکریں زیادہ کھائیں گے۔ خیر ہماری یہی سزا ہے بھائی یہ اُون میرا تو نہیں ہے میرے داماد میخائیل کا ہے۔"

"داماد بہادر خود کیوں نہیں آئے۔"

"اچھا ہاں۔ اس لئے کہ ...... ارے بھائی، وہ میاں تو ابھی طفلِ شیر خوار ہیں وہ کیا جانیں کہ کونسا اون بیچنا ہے کونسا اون خریدنا ہے۔ نام خدا بالکل بچے ہیں۔ امیر بننے کے خبط میں اپنا سارا پیسہ ڈبو دیا۔ اون خرید کر بیٹھ گئے۔ بہت ہاتھ پیر مارے مگر کسی نے ان کی مانگی قیمت پر مال نہیں اٹھایا۔ صاحبزادے فقیر ہو گئے۔ سال بھر جھک مارنے کے بعد میرے پاس آئے، پاپا مجھ پہ ایک احسان کریں کہ اس اون کو کسی طرح ٹھکانے لگا دیں۔ کاروبار میرے بس کی بات نہیں، اور یہ بات صحیح ہے۔ جب بات بگڑ جاتی ہے تو پاپا یاد آتے ہیں جب تک معاملات درست رہتے ہیں پاپا کی یاد نہیں آتی۔ جب یہ میاں اون خرید رہے تھے تو اس وقت انہوں نے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ لیکن اب جب مصیبت میں پھنس گئے تو اب پاپا بھگتیں اور یہ پاپا غریب اس بکھیڑے کو کیا جانے۔ وہ تو یہ کہئے کہ ایوان ایوینچ آڑے آ گئے۔ ورنہ ان کے پاپا کے بس کا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس اولاد نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔"

"صحیح فرمایا۔ اولاد آدمی کو بہت خوار کرتی ہے۔ اس کا تجربہ تو مجھے بھی ہے۔"

موسئے موسیوپچ نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"میرے چھ ہیں۔ ایک کو سکول جانا ہے دوسرے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے تیسرے کو پالنے میں جھلانا ہے اور جب بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر اور زیادہ

پریشانیاں پیدا کرتے ہیں۔مگر یہ اب کے زمانے ہی کی بات تو نہیں ہے۔
توریت شریف پڑھئے۔اگلے زمانوں میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔حضرت یعقوب
علیہ السلام کے جب بچے ہوئے تو آپ روئے۔جب یہ بچے بڑے ہوئے تو
آپ کو اور بھی زیادہ رونا پڑا۔"

"بجا کہا......"

پادری کرسٹنر نے تائید کی اور سوچ میں ڈوب گئے۔سامنے رکھے گلاس پہ نظریں جم گئیں۔

"مجھے اپنے رب سے کوئی شکایت نہیں ہے۔میں تو اپنی زندگی کے دن گزار چکا۔خداوند
تعالےٰ ہر کسی کو اس طرح کی زندگی کرنے کی توفیق دے...... میری بیٹیاں
سب اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔بیٹے بھی سب اپنے پیروں پہ کھڑے ہیں۔اپنے
اپنے ہلّے سے لگے ہوئے ہیں یہ الگ بات کہ کوئی کہیں ہے اور کوئی کہیں ہے
تو میں اب بےنِشت ہوں۔اپنے سارے فرض ادا کر دیئے۔اب میں جہاں جی چاہے
جاؤں جہاں جی چاہے رہوں۔اپنی پادرن کے ساتھ چین سے بسر کرتا ہوں۔گھر
میں خداوند کا دیا بہت ہے کھانے پینے کے لئے کوئی کمی نہیں۔چادر تان کے چین
کی نیند سوتا ہوں۔پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کے ساتھ مگن رہتا ہوں۔عبادت
کرتا ہوں اور مجھے کیا چاہیئے۔زمینوں سے جو آجاتا ہے اس پہ گزارہ ہے۔باقی
کسی سے کوئی حاجت نہیں رکھتا۔بچپن سے لے کر اب تک مجھے کبھی کسی پریشانی
نے نہیں گھیرا۔اب فرض کیجیئے کہ حضور زار والا مجھ سے سوال کریں کہ تمہیں کس
چیز کی خواہش ہے۔کیا چاہتے ہو تم۔حضور میں کچھ نہیں چاہتا۔جو میں نے چاہا
وہ خداوند کا شکر ہے کہ مجھے میسّر ہے۔پوری بستی میں مجھ سے زیادہ مطمئن آدمی
کوئی نہیں ہے۔ہاں یہ ہے کہ میں گنہگار آدمی ہوں۔مگر گناہ سے پاک تو بس
خداوند کی ذات ہے۔کیوں سچ ہے نا؟"

"بالکل صحیح۔"

"صحیح ہے کہ میرے دانت گر چکے ہیں۔ میری کمر درد کرتی ہے۔ گٹھیا کی تکلیف ہے۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ مجھے دمہ کا مرض لاحق ہے ایسی ہی اور بیماریاں دم کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ آئے دن بیمار رہتا ہوں۔ بدن میں اب سکت نہیں رہی۔ مگر یہ بھی تو دیکھو کہ میری عمر کتنی ہو گئی ہے۔ اسی کے پیٹے میں ہوں۔ کوئی سدا تو جیتا نہیں رہتا۔ آدمی کو بہت ہاتھ پاؤں نہیں پھیلانے چاہئیں۔"

پادری کرسٹفر کو اچانک کوئی بات یاد آگئی۔ گلاس میں منہ دے کر ہنسنے لگے لیکن پھر اپنی ہنسی کو روک لیا موسیو پ بھی اخلاقاً ہنسا اور پھر اسی طرح اپنی ہنسی کو اس نے روک لیا۔

"اچھی خاصی مذاق کی بات ہے۔"

پادری کرسٹفر نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا

"میرا بڑا بیٹا گوریل مجھ سے ملنے آیا۔ وہ ڈاکٹر پیشہ ہے۔ تچر نگف کے صوبے میں ایک قصبے میں ڈاکٹر لگا ہوا ہے۔ میں نے کہا بیٹے دمہ میرے دم کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ ویسے بھی آئے دن کوئی نہ کوئی بیماری اٹھ کھڑی ہوتی ہے تم اپنے باپ کا کچھ علاج معالجہ کرو۔ اس نے وہیں اسی وقت میرے کپڑے اتروائے مجھے ٹھونک بجا کے دیکھا۔ کان لگا کر سنا۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر لوگ مریض کے ساتھ جو چکر بازی کرتے ہیں وہ سب اس نے کیں۔ میرا پیٹ بھی خوب ملا دلا پھر بولا "پاپا، آپ کو کمپریسڈ ائیر د
ے کے علاج کی ضرورت ہے۔"

پادری کرسٹفر یہ کہتے کہتے اس زور سے ہنسے کہ پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور میں نے بیٹے سے کہا کہ تمہارے کمپریسڈ ائیر پہ خدا کی مار۔"

اسی طرح ہنسی سے بل کھاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا
"تمہارے کمپر لیسڈاٹرپہ خدا کی مار"

موسئے موسیوچ بھی اسی زور شور سے ہنسا کہ اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر ایسی تند و تیز آواز نکالی جیسے پالتو کتا نکالتا ہے۔

"کمپر لیسڈاٹر پہ خدا کی سنوار" پادری کرسٹفر اسی طرح بے تحاشا ہنسے جا رہے تھے۔

موسئے موسیوچ کا قہقہہ ان سے دو ڈگری اوپر تھا۔ ایسا بے تحاشا ہنس رہا تھا کہ اس کے لئے کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ ہنسی سے بل کھاتے ہوئے مشکل سے بولا۔

"اوہ خداوندا۔ مجھے سانس تو لے لینے دو۔۔۔۔۔۔ میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔"

ہنستا جاتا تھا اور بولتا جاتا تھا ساتھ میں مشتبہ نظروں سے اور جھینپو سے انداز میں سلیمان کو بھی دیکھتا جاتا تھا۔ ادھر سلیمان اپنے اسی طور کے ساتھ کھڑا تھا اور اسی طرح مسکرا رہا تھا اس کی نظروں اور اس کی مسکراہٹ سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کی نفرت اور اس کی حقارت میں ایک کھرا پن ہے لیکن اس کی یہ کھری نفرت اور حقارت کی کیفیت اس کی پر پیچ قسم کی شخصیت سے کوئی لگا نہیں کھا رہی تھی۔ سو اس حالت میں اسے دیکھ کر ایگور شکا کو یوں لگ رہا تھا کہ سلیمان نے جو طنز بھری مسکراہٹ اور ٹکر لینے کا سا طور اپنایا ہوا ہے۔ اس کا مقصد بس اتنا ہے کہ احمق الذی کا سوانگ بھر کر اپنے معزز مہمانوں کی تفریح طبع کا سامان کیا جائے۔

کزمشوف نے چائے کی چھ پیالیاں چڑھا لینے کے بعد میز پہ اپنے سامنے کی تھوڑی سی جگہ صاف کی، اپنا وہ تھیلا نکالا جو ٹم ٹم تلے سوتے وقت اپنے سر کے نیچے رکھ لیا تھا، تسلی کی جو گرہ لگی تھی اسے کھولا اور ہلا جھلا کر دیکھا۔ تھیلے میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکل کر میز پہ بکھر گئیں۔

"فادر کرسٹفر میں نے سوچا کہ جو وقت ملا ہے اس میں رقم کی گنتی ہی کر لی جائے۔"

موسیے موسیوچ رقم دیکھ کر سٹپٹا گیا شرفا کے طور کو اپناتے ہوئے کہ دوسروں کے نجی معاملات میں تاک جھانک سے احتراز کرتے ہیں وہ اٹھا اور بازو ہلاتا دبے پاؤں کمرے سے نکل گیا سلیمان اپنی جگہ پر جما کھڑا رہا۔

"کتنے کتنے کی گڈیاں ہیں؟" پادری کرسٹفر نے پوچھا۔

"ایک ایک ربل والے نوٹ پچاس کے لگ بھگ ہیں تین ربل والے نوے کے لگ بھگ ہیں۔ ایک سو پچیس والے ہزار سے اوپر ہیں۔ آپ سات ہزار آٹھ سو ورلموف کے لئے گن لیں میں گسیوچ کے لئے رقم گنتا ہوں اور دیکھئے غلطی نہیں ہونی چاہیئے۔"

ایگوزنکا کے سامنے اس وقت جتنی رقم میز پہ بکھری پڑی تھی اتنی رقم اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی یہ رقم یقیناً بہت زیادہ ہو گی کیونکہ پادری کرسٹفر نے ورلموف کے لئے سات ہزار آٹھ سو کی جو گڈیاں گن کر الگ رکھیں وہ تو اس ڈھیر کے مقابلہ میں بہت تھوڑی نظر آ رہی تھیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو روپے پیسے کا اتنا ڈھیر دیکھ کر ایگوزنکا بہت مرعوب ہوتا اور کچھ اس انداز سے سوچتا کہ اتنی رقم میں کتنے کیک بسکٹ آ سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت اس نے اس ڈھیر کو بڑی بے دلی سے دیکھا۔ اس وقت تو بس اس ڈھیر سے اٹھتی ہوئی مٹی کے تیل اور گلے سڑے سیبوں کی بو اسے پریشان کر رہی تھی۔ ٹم ٹم کے ہچکولوں نے اسے بے دم کر دیا تھا۔ بہت تھک گیا تھا اور غنودگی طاری تھی اس کا سر بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ دماغ میں چکر کاٹتے خیالات الجھی ہوئی ڈور کی طرح ہو رہے تھے۔ اگر اس کا بس چلتا تو میز پہ سر رکھ کر تھوڑا سستا لیتا۔ اس طرح لیمپ کو اور نوٹوں کو گنتی انگلیوں کو دیکھنے کی کوفت سے بھی بچ جاتا اور اس کے تھکے ماندے سوئے سوئے دماغ کو بھی بہکنے بھٹکنے کا زیادہ موقع مل جاتا۔ جب وہ جاگتے رہنے کی کوشش کرتا تو لیمپ

کی روشنی، پیالیاں، انگلیاں سب ڈبل دکھائی دیتیں۔ سموار سنسنانے لگی گلے سڑے سیبوں کی بو زیادہ کسیلی زیادہ متعفن محسوس ہوئی۔

"پیسہ، پیسہ"، پادری کرسٹفر نے ٹھنڈا سانس بھرا تھوڑا مسکرائے۔" اے پیسے تو سر پہ مصیبتیں لاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اپنا میخائیل اس وقت مزے سے سویا ہوا ہوگا۔ خواب دیکھ رہا ہوگا کہ میں پیسے کا ایسا ہی ڈھیر اس کے لئے سمیٹ کر لے جاؤں گا۔"

"آپ کا میخائیل تمو فیوچ بہت نکما ہے"، کزمشوف نے دبے لفظوں میں کہا "اپنے معاملات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔ آپ بھی تو ہیں۔ خیر سے کتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ اب اگر آپ یہ اون جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھے دے دیں اور خود فراغت پا کر واپس چلے جائیں اور میں جیسا کہ میں اپنی رضامندی ظاہر کر چکا ہوں جو بھاؤ ہے اس سے ادھا ریل زیادہ پر قیمت لگاؤں اور وہ بھی یہ لحاظ کرتے ہوئے کہ ......"

"نہیں بھئی"، پادری کرسٹفر نے لمبا سانس لیا "تمہاری عنایت کا شکریہ ..... اگر یہ مال میرا ہوتا تو بس کوئی حیل و حجت ہی نہ کرتا لیکن تم تو جانتے ہی ہو کہ مال میرا نہیں ہے۔"

موسئے موسیوچ دبے پاؤں اندر آیا۔ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ نوٹوں کی ڈھیری سے نظریں بچاتے ہوئے چپکے سے ایگوزشکا کے پاس پہنچا اور اس کی قمیص کے دامن کو پکڑ کر ہلایا۔

"ننھے میاں، ذرا میرے ساتھ چلو" دھیرے سے کہا "تمہیں کچھ دکھائیں۔ دیکھنا ذرا کیسا چھوٹا سا عجیب قسم کا کچھ ہے اوا اوا اوڑ۔"

ایگوزشکا کو نیند آ رہی تھی۔ اپنی نیند کی حالت میں اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیکھنے کے لئے بڑی بے دلی سے موسئے موسیوچ کے ساتھ گھسٹتا گھسٹتا چلنے لگا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں کیا تھا یہ تو اس نے بعد میں دیکھا۔ پہلے تو بدبو کا ایسا بھبکا آیا کہ اس کے لئے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ کچھ ایسی بدبو تھی جیسے کوئی چیز گل سڑ رہی ہو۔

گئی ہو۔ بڑے کمرے میں جو بسا ند پھیلی ہوئی تھی یہ اس سے کہیں زیادہ تیز تھی اور شاید وہ بساند بھی اسی کمرے سے اٹھ کر وہاں گئی تھی۔ کمرے میں ایک طرف ایک بڑا سا پلنگ بچھا تھا جس پر ایک میلا چیکٹ لحاف پڑا تھا۔ دوسرے گوشے میں دراز ون والی ایک پیٹی رکھی تھی اور چیتھڑوں گودڑوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا جس میں عورتوں کے پیٹی کوٹ سے لے کر بچوں کے جانگیوں اور تسموں تک ہر مال رلا ملا نظر آرہا تھا۔ پیٹی کے اوپر ایک تیل بتی والا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ننھے کو دکھانے کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ تو اسے نظر نہ آیا۔ اس کی بجائے ایک دھوندل کاٹ بہوون دکھائی دی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ لال فلالین کا سکرٹ پہن رکھا تھا جس پر سیاہ رنگ کے بیل بوٹے بنے تھے۔ پلنگ اور پیٹی کے درمیان جگہ اتنی تنگ تھی کہ بڑی مشکل سے وہ مڑ کر آئی اور ایسی آوازیں نکالیں جیسے اس کے دانت میں درد ہو رہا ہو۔ ایگور نشکا کو دیکھ کر اس نے مغموم سا چہرہ بنایا، لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور اس سے پہلے کہ وہ ادھر ادھر دیکھے اس بی بی نے شہد سے لسا ایک، ڈبل روٹی کا ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

"کھالو۔ بیٹے کھالو۔ یہاں تمہاری امی تو ہیں نہیں کوئی تمہاری خبر لینے والا نہیں ہے۔ کھالو۔"

ایگور نشکا نے کھا تو لیا۔ لیکن اپنے گھر روزانہ جو اسے میٹھی پوریاں اور خشخاش کی ٹکیاں کھانے کو ملتی تھیں ان کے بعد شہد کو وہ کیا خاطر میں لاتا اور شہد بھی ایسا جس میں مکھیوں کے پر اور موم گھلا ہوا تھا۔ وہ کھانے لگا تو موسلے موسیوچ اور موٹی بہودن نے اسے دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔

بہودن پوچھنے لگی "لال، تم کہاں جا رہے ہو۔"

"سکول جا رہا ہوں" ایگور نشکا نے جواب دیا۔

"تمہارے کتنے بھائی ہیں، کتنی بہنیں ہیں۔"

"میں اکیلا ہوں۔ اور کوئی نہیں ہے۔"

"ہائے ہائے" یہودن نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اوپر کی طرف دیکھا "بے چاری ماں۔ بے چاری۔ تمہیں یاد کر کر کے کتنا روئے گی۔ برس بعد ہمیں بھی اپنے نا ہم کو سکول بھیجنا ہے۔"

"ہاں اپنا نا ہم۔" موسئے موسیوچ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس کے پھیکے بے رونق چہرے کی جلد میں ایک کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ "اپنا ناہم۔ اتنا تو وہ نازک ہے۔"

میلے چیکٹ لحاف میں جنبش ہوئی۔ ایک بچے نے اندر سے سرنکالا گھنگھریالے بال، دبلی پتلی گردن۔ کالی کالی ان دو آنکھوں میں ایک چمک آئی اور ایک تجسّس کے ساتھ وہ ایگورشکا کو تکنے لگیں۔ موسئے موسیوچ اور یہودن دونوں ابھی تک ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے۔ اس طرح آہیں بھرتے ہوئے پیٹی کے پاس جا کھڑے ہوئے موسئے موسیوچ یدش زبان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ یدش زبان میں اس کی گفتگو کیا تھی، بس غال غال غال غال کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی بیوی جواب تند و تیز آواز میں دے رہی تھی جس سے یوں لگتا تھا کہ فیل مرغ ٹائیں ٹائیں کر رہا ہے۔ ٹوٹو ٹوٹو کی قسم کی آوازیں آ رہی تھیں اور تو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھر وہ آپس میں کچھ صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ ادھر میلے چیکٹ لحاف سے ایک اور چھوٹا سا سر نکلا۔ ویسے ہی گھنگھریالے بال، ویسی ہی دبلی پتلی گردن پھر تیسرا سر نکلا۔ پھر چوتھا........ اگر کہیں ایگورشکا زرخیز تخیل کا مالک ہوتا تو یہی سمجھتا کہ لحاف کے اندر کوئی سو سروں والی بلا کلبلا رہی ہے۔

"غال غال غال غال،" موسئے موسیوچ کہہ رہا تھا۔

"ٹوٹو ٹوٹو ٹوٹو،" یہودن نے جواب دیا۔

صلاح مشورہ کا آخر ایک نتیجہ نکلا کہ یہودن نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے پیٹی کی ایک دراز کھینچی۔ وہاں ہرے چیتھڑے میں لپٹی کوئی چیز رکھی تھی۔ اسے کھولا تو اس میں سے رئی کا ایک بڑا سا کیک نکلا جو دل کی شکل کا بنا ہوا تھا۔

"لال، یہ لو"، کیک ایگورشکا کو دیتے ہوئے کہنے لگی "اب یہاں تمہاری امی تو ہیں نہیں۔ تمہیں اچھی اچھی چیزیں دینے والا کون ہے"۔

ایگورشکا نے کیک لے کر اپنی جیب میں ٹھونس لیا اور گرتا پڑتا دروازے کی طرف چلا۔ اصل میں اب وہ مزید اس بساندھ بھری فضا میں سانس نہیں لے سکتا تھا۔ موسئے موسیوچ اور یہودن کو کیا، وہ تو رہتے ہی اس فضا میں تھے۔ واپس بڑے کمرے میں پہنچ کر وہ آرام سے صوفے پر پسر گیا اور اب اس نے اپنے اوپر کھا رکھے خیالوں کو جنہیں ابھی تک دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھلی چھٹی دے دی۔

کزمشوف نے جب نوٹوں کی گنتی کر لی تو انہوں نے ترت کے ترت انہیں پھر تھیلے میں ڈال لیا۔ ان نوٹوں کے لئے ان کے یہاں کوئی احترام کا جذبہ نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے تو نوٹوں کی ڈھیری اپنے گندے سڑے تھیلے میں اس بے پروائی سے ٹھونسی جیسے یہ رقم نہ ہو۔ ردی کاغذ ہوں۔

ادھر پادری کرسٹفر سلیمان سے باتیں کر رہے تھے۔

"اچھا سلیمان حکیم یہ بتاؤ"۔ انہوں نے جماہی لیتے ہوئے اور ساتھ میں سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ کہ کاروبار کیسا چل رہا ہے"۔

"آپ کونسے کاروبار کی بات کر رہے ہیں"،

سلیمان نے ایسے بگڑ کر پوچھا جیسے پادری صاحب نے اسے کسی جرم میں ملوث دیکھ لیا ہو۔ اور اس طرف اشارہ کیا ہو۔

"بھئی کسی خاص کاروبار کے بارے میں نہیں پوچھا۔ مطلب یہ ہے کہ تم کیا کر رہے ہو"،

"میں کیا کر رہا ہوں"؟

سلیمان نے بات کو دہرایا اور کاندھے مچکائے

"وہی جو سب کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ آپ جانیں کہ میں تو بھنگی ہوں بھنگی اپنے بھائی کی چاکری کرتا ہوں اور میرا بھائی۔ یہاں آنے والوں کی چاکری کرتا ہے اور یہاں آنے والے ورلموف کی چاکری کرتے ہیں اور اگر میرے پاس دس لاکھ کی رقم ہوتی تو ورلموف میری چاکری کرتا۔"

"تمہاری چاکری وہ کیسے کرتا؟"

"کیسے؟ ایسے کہ یہاں کوئی ناک والا، کوئی لکھ پتی کروڑ پتی ایسا نظر نہیں آتا جو پیسے کی خاطر کسی کنجوس یہودی کی دست بوسی کے لئے تیار نہ ہو۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں ایک کنجوس مکھی چوس یہودی ہوں اور ساتھ میں قلاش بھی ہوں۔ لوگوں کے لئے میں کتے کی مثال ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس دولت ہوتی تو ورلموف میری جی حضوری کرتا جیسے اب موسیو چ آپ کی جی حضوری کر رہا ہے۔"

پادری کرسٹفر اور کزمشوف نے ایک دوسرے کو دیکھا دونوں ہی یہ سمجھنے سے قاصر نظر آتے تھے کہ سلیمان یہ کیا بک بک کر رہا ہے۔ کزمشوف نے سلیمان کو گھور کے دیکھا۔

"ابے او کاٹھ کے الو، تیرا اور ورلموف صاحب کا کیا مقابلہ؟"

"میں اتنا الو نہیں ہوں کہ ورلموف کے ساتھ اپنا مقابلہ کروں۔"

سلیمان نے طنزیہ نظروں سے کزمشوف کو دیکھا۔

"ویسے تو وہ روسی ہے لیکن ذرا کرید کے دیکھو تو اندر سے وہی کنجوس مکھی چوس یہودی نکلے گا۔ پیسہ اور منافع، لے دیکے یہ ہے اس کی زندگی کا نصب العین مگر میں نے اپنا پیسہ چولہے میں جھونک دیا۔ نہیں چاہئے مجھے پیسے۔ نہ پیسہ نہ زمین نہ ڈھور ڈنگر۔ سو لوگ مجھ سے کیوں ڈریں اور مجھے دیکھ کر ادب سے ہیٹ کیوں اتاریں۔ سو میں آپ لوگوں کے ورلموف سے زیادہ عقلمند ہوں

مجھ میں زیادہ آدمیت ہے۔"

ایگورشکا آدھا سو رہا تھا آدھا جاگ رہا تھا۔ اسی نیم غنودگی کے عالم میں اسے سلیمان کی نفرت آلود رندھی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی کہ تیز تیز کچھ اٹک اٹک کر یہودیوں کے بارے میں بول رہا ہے پہلے تو وہ روسی زبان میں پوری صحت کے ساتھ بولتا رہا۔ پھر وہ یہودیوں والے محاورے پہ آ رہا بس جیسے اس نے میلہ میں یہودیوں والے لہجہ میں مبالغہ کا رنگ پیدا کر کے مکالمے بولے تھے ویسے ہی اس وقت بولنا شروع کر دیا۔

"رکو" پادری کرسٹفر بولے۔

"دیکھو اگر تمہیں اپنا مذہب نہیں بھاتا تو اسے ترک کر دو۔ لیکن اس کی تضحیک مت کرو، یہ گناہ ہے۔ کوئی اسفل ہی ہو گا کہ اپنے مذہب کا مذاق اڑائے گا"

"آپ سمجھے ہی نہیں۔"

سلیمان نے بڑی بدتمیزی سے پادری صاحب کی بات کاٹی

"میں کچھ اور بات کر رہا ہوں۔ آپ کسی اور طرف لے گئے۔"

"تم بہت بے وقوف ہو۔"

پادری کرسٹفر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"میں تمہیں بساط بھر سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تمہیں غصہ آ رہا ہے میں تو ایک بزرگ کی طرح تم سے رسان سے بات کر رہا ہوں اور تم ہو کہ فیل مرغ کی طرح ٹرٹر کر رہے ہو۔ تم واقعی کچھ نرالی ہی مخلوق ہو۔"

اتنے میں موسی موسیوچ بھی آ گیا۔ اس نے گھبرا کر سلیمان کو دیکھا۔ پھر مہمانوں پہ ایک نظر ڈالی اور اس کے چہرے کی کھال کپکپانے لگی۔ ایگورشکا نے اپنے سر کو جنبش دی اور ادھر ادھر دیکھا۔ چھچلتی سی ایک نظر سلیمان کے چہرے پہ پڑی عین اس گھڑی جب اس کا تین چوتھائی رخ اس کی طرف ہو گیا تھا اور جب اس کی ناک کان کا سایہ چہرے پر اس طرح پڑ رہا

تھا کہ اس کا رخسار دو حصوں میں بٹا نظر آ رہا تھا۔ اس سائے میں گھلی ملی وہ تحقیر آمیز مسکراہٹ، وہ چمکتی طنز میں ڈوبی آنکھیں۔ وہ سرکشی کے سے تیور، اور وہ دم کٹے پرندے کا سا پورا سراپا یہ سب مل کر ایگورشکا کی نظروں کے سامنے اس طرح متحرک تھا کہ اب وہ اسے مسخرے کی طرح کا نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ کبھی کبھی آدمی کو خواب میں جو بد روح نظر آتی ہے اس سے ملتا جلتا دکھائی دے رہا تھا۔

"موسئے موسیوچ، تمہارے گھر میں شیطان گھس آیا ہے۔ خداوند اس پہ اپنا رحم کرے۔"

پادری کرسٹفر مسکرا کر کہنے لگے۔

"اس کا کوئی بندوبست کرو۔ اس کی شادی کر دو۔ یا اور جو انتظام کرنا چاہو...... آدمی تو وہ کسی طرف سے نظر آتا نہیں۔"

کز مشوف غصے سے بڑبڑانے لگے۔ موسئے موسیوچ نے ایک مرتبہ پھر سٹپٹا کر سوالیہ نظروں سے پہلے اپنے بھائی کو اور پھر مہمانوں کو دیکھا۔

"سلیمان، جاؤ یہاں سے۔" اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ "چلے جاؤ یہاں سے۔"

پھر اسی کے ساتھ کچھ یدش زبان میں کہا۔ سلیمان بے ڈھنگے پن سے ہنسا اور باہر نکل گیا۔

"بات کیا ہوئی؟" موسئے موسوچ نے پادری کرسٹفر سے پوچھا۔

"وہ اپنی اوقات بھول جاتا ہے۔" کز مشوف نے کہا "بدتمیز ہے۔ اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے"، موسئے موسیوچ بدحواس ہو گیا اور مٹھیاں بھینچ لیں "اُف میرے خداوند"، پھر اس کا لہجہ دھیما ہو گیا "آپ مہربانی کر کے درگزر کر دیں ناراض نہ ہوں۔ وہ عجب قماش کا ہے بہت عجب قماش کا ہے۔ اف میرے خداوند۔ ویسے تو وہ میرا بھائی ہے لیکن اس کی ذات سے مجھے کبھی فیض تو پہنچا نہیں۔ ہمیشہ تکلیف ہی پہنچی۔

یہ سمجھے کہ وہ ...." موسئے موسیویچ نے اپنے ماتھے پہ انگشت شہادت لے جاکر اسے ٹھکایا اور پھر کہنے لگا "سنک گیا ہے ... کسی جوگا نہیں ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ نہ کسی کا لحاظ نہ کسی کا ادب نہ کسی کا ڈر .... جسے دیکھتا ہے اس پہ ہنسنا شروع کر دیتا ہے اول جلول باتیں کرنے لگتا ہے۔ ہر ایک سے بے تکلفی پر اتر آتا ہے آپ یقین نہیں کریں گے، ہوا یہ کہ ایک دن یہاں ورلوف صاحب تشریف لائے اور سلیمان نے ان سے ایسی باتیں کیں کہ انہوں نے ہم دونوں کو کوڑے مار مار کے مزہ چکھا دیا ..... مگر مجھے انہوں نے کیوں کوڑے مارے۔ بھلا اس میں میرا کیا قصور تھا۔ رب نے اسے عقل سے محروم کر دیا ہے تو یہ تو رب کی مرضی تھی۔ میں کیسے موردِ الزام ٹھہرا"

دس منٹ گزر گئے تھے اور موسئے موسیویچ اسی طرح بولے چلا جا رہا تھا۔ بڑبڑا رہا تھا "رات کو ذرا جو سوتا ہو۔ ہر وقت خیالوں میں غلطاں رہتا ہے، ہر وقت سوچنا، سوچتے رہنا، سوچتے رہنا، خدا ہی جانے کیا سوچتا رہتا ہے اگر رات کو کوئی اس کے پاس چلا جائے تو اسے غصہ آ جاتا ہے اور پھر وہ ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔ مجھے بھی وہ پسند تو نہیں کرتا ..... اور کسی چیز کی اسے طلب ہی نہیں ہے جب ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوا تو انہوں نے ہم دونوں کے لئے چھ چھ ہزار ربل کی رقم چھوڑی تھی۔ میں نے اپنی اس رقم سے ایک سرائے خریدی، شادی کی اور اب میں خیر سے بیوی بچوں والا ہوں۔ مگر اس نے اپنی ساری رقم جلتے چولہے میں جھونک دی کتنے افسوس کی بات ہے۔ بھلا جلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اسے وہ رقم نہیں چاہیئے تھی تو وہ مجھے دے سکتا تھا۔ بھلا جلانے کی کیا ضرورت تھی"

اچانک دروازہ چوں سے بولا اور فرش پر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ یگورشکا کو اپنے چہرے پر ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا محسوس ہوا۔ پھر ایسا لگا کہ کوئی بڑا سا سیاہ پرندہ اس کے برابر سے گزرا ہے اور بالکل اس کے چہرے کے قریب آ کر اپنے بازو پھڑپھڑائے ہیں اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا .... اس کے ماموں صاحب تھیلا ہاتھ میں

لئے صوفے کے برابر جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ پادری کرسٹفر اپنے چوڑے کناروں والا ہیٹ اتار کر کسی کو جھک کر سلام کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے لیکن یہ ان کی معمول کی دھیمی مشفقانہ مسکراہٹ نہیں تھی۔ یہ تو ایک مودبانہ قسم کی مسکراہٹ تھی جس میں آورد کا رنگ تھا۔ یہ مسکراہٹ ان کے چہرے سے کچھ لگا نہیں کھا رہی تھی۔ ادھر موسیٔے موسیلوچ کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے اس کے جسم کے تین ٹکڑے ہو گئے ہوں اور وہ جان توڑ کوشش کر رہا ہو کہ ٹکڑے بکھرنے نہ پائیں اور کسی طرح سے ایک توازن قائم ہو جائے۔ صرف ایک سلیمان تھا کہ ایک کونے میں ہاتھ باندھے سکون سے کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہی تحقیر آمیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ کھیل رہی تھی۔

"محترمہ معافی چاہتا ہوں کہ یہ جگہ زیادہ صاف ستھری نہیں ہے" موسیٔے موسیلوچ نے ایک اذیت ناک حد تک شیریں مسکراہٹ کے ساتھ بڑی لجاجت سے عرض کیا۔ اس وقت اس نے کرنسٹوف اور پادری کرسٹفر کو یکسر فراموش کر دیا تھا اس وقت تو وہ سر سے پیر تک ایسے ڈول رہا تھا جیسے کوشش کر رہا ہو۔ کہ اس کا جسم گر کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ "محترمہ، ہم سیدھے سادھے لوگ ہیں"

ایگورشکا نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ کمرے کے وسط میں واقعی ایک محترمہ کھڑی تھیں ایک بھرے بھرے بدن کی حسین و جمیل جوان خاتون سیاہ پوشاک میں ملبوس سر پہ تنکوں والا ہیٹ رکھے ہوئے۔ ایگورشکا نے ابھی اس کے خدوخال کا پورا جائزہ نہیں لیا تھا کہ اس کے تصور میں جانے کیسے چنار کا وہ پروقار اکیلا درخت ابھر آیا جو اس نے اسی دن پہاڑی پر کھڑے دیکھا تھا۔

"ورلموف صاحب آج یہاں آئے تھے؟"

"نہیں محترمہ،" موسیٔے موسیلوچ نے جواب دیا۔

"اگر کل وہ تمہیں مل جائیں تو ان سے کہنا کہ ذرا مجھ سے مل لیں"

ایگورشکا کو اچانک بالکل غیر متوقع طور پر ایک عجیب نظارہ دکھائی دیا اپنے برابر آدھے انچ کے فاصلہ پر مخملیں سیاہ پلکیں، نازک نسوانی رخسار جن میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور جن سے ایک تبسم کی لہر اٹھ کر سورج کی شعاعوں کی مانند پورے چہرے پر پھیلتی نظر آ رہی تھی اور ایک بھینی بھینی مہک۔

"کیسا پیارا بچہ ہے" خاتون کہنے لگی:

"کس کا ہے یہ بچہ۔ اے کازمرنخالووچ ذرا دیکھو تو سہی، کیسا منّا سا ہے ہائے اللہ، وہ تو سو رہا ہے"

اور خاتون نے جھک کر ایگورشکا کے دونوں گالوں کو چٹاخ چٹاخ چوما۔ ایگورشکا کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بھی تصور کر لیا کہ وہ سو رہا ہے اور اس نے آنکھیں موند لیں۔ دروازہ چرچراتا ہوا کھلا اور آتے جاتے جلد جلد اٹھتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"ایگورشکا۔ ایگورشکا" اسے دو بھاری دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔

"اٹھو، چلنے کا وقت آ گیا"

کسی نے لگتا تھا کہ وہ دنیسکی ہے، اسے پیروں پہ کھڑا کر دیا اور بازو پکڑ کر اسے لے کر چلنے لگا۔ رستہ چلتے چلتے اس نے آدھی آنکھیں کھولیں اور پھر اسی سیاہ پوشاک والی حسین و جمیل خاتون کو دیکھا جس نے اس کی چمیاں لی تھیں۔ وہ بیچ کمرے میں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی مسکرا رہی تھی اور ایک دوستانہ انداز میں سر ہلا رہی تھی۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خوش شکل گٹھے ہوئے بدن کا سانولی رنگت والا شخص باؤلر ہیٹ لگائے چمڑے کے موزے چڑھائے مستعد کھڑا ہے ضرور یہ اس خاتون کا محافظ ہوگا۔

"ور وا" احاطہ سے ایک آواز سنائی دی۔

بڑے دروازے پر پہنچ کر ایگورشکا نے یہ دیکھا کہ دو سیاہ رنگ گھوڑوں والی ایک شاندار بگھی کھڑی ہے۔ اونچی باکس سیٹ پر ایک سائیس وردی میں ملبوس لمباسا چابک ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے اور تو کوئی نہیں بس سلیمان ان مسافروں کو چھوڑنے کے لئے باہر تک آیا۔ اس نے اپنی ہنسی دبا رکھی تھی جس سے اس کے چہرے پہ تناؤ آ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سخت بے چین ہے کہ کسی طرح مسافر یہاں سے ٹلیں اور پھر وہ ان پر جی کھول کر ہنسے۔

" یہ کاؤنٹس ورانسکی صاحبہ تھیں "، پادری کرسٹفر نے ٹم ٹم میں بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

" ہاں کاؤنٹس ورانسکی تھیں "، کزمشوف نے بھی اسی آہستگی سے کہا۔

کاؤنٹس کی تشریف آوری کا شاید بہت گہرا اثر ہوا تھا ورنہ تو او ردینسکی بھی دبے دبے لہجہ میں بول رہا تھا اور کہیں اس وقت جا کر اس نے اپنے گھوڑوں پر چابک برسانے اور اونچی آواز نکالنے کی جرات کی جب ٹم ٹم کوئی چوتھائی میل آگے نکل آئی تھی اور سرائے نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بس ایک دھندلی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

---

(۴)

کون ہے یہ پراسرار چھلاوہ قسم کا شخص جس کا نام درلوف ہے جس کا لوگ اتنا ذکر کرتے ہیں جس سے سلیمان سخت متنفر ہے اور جس کی حسین و جمیل کاؤنٹس کو بھی طلب رہتی ہے۔ ایگورنسکا دینسکی کے برابر باکس سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اس شخص کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس نے اسے دیکھا تو کبھی نہیں تھا۔ لیکن اس کا ذکر بہت سنا تھا اور خیال ہی خیال میں اس کا ایک تصور قائم کر لیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ درلوف ہزاروں ایکڑ زمین کا سینکڑوں ہزاروں بھیڑوں کا مالک ہے اور پیسہ اس کے پاس الغاروں ہے۔ مگر یہ کہ اس کی زندگی کا طور کیا ہے، کیا اس کا پیشہ ہے، اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہاں اتنا پتہ تھا کہ وہ ہمیشہ ان علاقوں کا دورہ کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ لوگوں کو اس کی تلاش رہتی ہے۔

کاؤنٹس ورانسکی کے بارے میں بھی اس نے گھر میں بہت سی باتیں سنی تھیں۔ وہ بھی دسیوں ہزار ایکڑ زمین اور بہت سی بھیڑوں کی مالک تھی۔ گھوڑوں کا ایک فارم تھا۔ دولت میں کھیلتی تھی لیکن وہ دورے نہیں کرتی تھی۔ اطمینان سے گھر میں بسر کرتی تھی۔ گھر نہایت عالی شان تھا۔ اس سے ملحق وسیع و عریض اراضیات تھیں۔ اس گھر کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔

ایوان ایوینچ نے تو کاروبار کے سلسلہ میں کئی مرتبہ اس گھر کے پھیرے لگائے تھے۔

انہوں نے اور دوسرے جاننے والوں نے اس گھر کے متعلق کتنی ہی کہانیاں سنائی تھیں ۔مثلاً وہ بتاتے تھے کہ کاؤنٹس صاحبہ کے ڈرائنگ روم میں چاروں طرف دیواروں پر پولینڈ کے تمام بادشاہوں کی تصویریں آویزاں ہیں اور انہیں کے بیچ ایک بڑی سی گھڑی ہے جو ایک چٹان کی شکل کی ہے۔ چٹان پر ایک سونے کا گھوڑا بنا ہوا ہے جس کی آنکھیں ہیرے کی ہیں اور جو ہنہناتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ گھوڑے پر ایک سوار ہے کہ وہ بھی سونے کا بنا ہوا ہے جب گھڑی گھنٹہ پورا کر کے بجتی ہے تو سوار اپنی تلوار کو دائیں بائیں گھماتا ہے۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ کاؤنٹس صاحبہ سال میں دو بار بال کی طرز کی دعوت کا اہتمام کرتی ہیں جس میں صوبے کے تمام امرا ، اعلیٰ حکام حتیٰ کہ ورملوف صاحب بھی مدعو ہوتے ہیں یہ سب مہمان چاندی کی سموار سے چائے بنا بنا کر پیتے ہیں ۔ نرالی طرح کی لذیذ اشیا سے لطف اندوز ہوتے ہیں (مثلاً بڑے دن کے موقع پر جاڑوں کے موسم میں وہاں رس بھری اور سٹابری سے تواضع کی جاتی ہے) اور بینڈ کی دھن پر جو سارے دن اور ساری رات بجتا رہتا ہے وہ خوب رقص کرتے ہیں۔

"اور وہ خوبصورت کتنی ہے؟" ایگورشکا کی آنکھوں میں اس کا چہرہ، اس کی مسکراہٹ پھر گئی۔

کزمشوف ماموں بھی شاید کاؤنٹس ہی کے متعلق سوچ رہے تھے اس لئے کہ جب ٹم ٹم کوئی ڈیڑھ میل آگے نکل گئی تو وہ کہنے لگے "یہ جو شخص ہے کزمیر خالووچ ـــــ اس خاتون کو بری طرح لوٹ رہا ہے کیا خیال ہے آپ کا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سے پچھلے سال جب میں نے کاؤنٹس سے کچھ اون خریدا تھا تو اس ایک سودے سے اس نے تین ہزار کی رقم بنائی تھی۔"

"کسی پولینڈ والے سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔" پادری کرسٹفر بولے۔

"اور وہ بی بی ہے کہ اسے کسی بات کی کوئی فکر ہی نہیں ہے وہ جو کہتے ہیں کہ

جوانی دیوانی ہوتی ہے تو اس عورت کے دماغ میں خناس بھرا ہوا ہے۔"

ایگورشکا کی خواہش نہ جانے کس باعث اس وقت یہ تھی کہ بس ورلموف اور کاؤنٹس کے بارے میں سوچتے رہو۔ خاص طور پر کاؤنٹس کے بارے میں۔ غنودگی میں ڈوبے اس کے ذہن نے معمولی خیالات کو تو راہ دینے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ دل و دماغ میں اس وقت ایک گھٹا سی امنڈی ہوئی تھی۔ وہاں اس وقت صرف ان تصویروں کی گنجائش تھی جو پریوں کے قصے کہانیوں سے جنم لیتی ہیں ان تصویروں کو یہ سہولت ہوتی ہے کہ تصور کرنے والے کی مساعی کا انہیں مرہونِ منت ہونا نہیں پڑتا۔ وہ بس خود ہی دماغ میں ابھر آتی ہیں اور خود ہی سر کی ذرا سی جنبش سے غائب غلہ ہو جاتی ہیں اس وقت اس کے ارد گرد کی فضا معمولی روزمرہ کے خیالات کے لئے بالکل سازگار نہیں تھی۔ دائیں سمت میں اندھیری پہاڑیاں تھیں جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کے پیچھے سے کوئی انجانی دہشت ناک مخلوق جھانک رہی ہے۔ بائیں سمت میں افق کے آس پاس سارا آسمان سرخی سے دمک رہا تھا اور یہ طے کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کہیں آگ لگی ہوئی ہے یا چاند نکلنے کو ہے دن کی طرح اس وقت بھی فاصلے تو دکھائی دے رہے تھے لیکن فاصلوں کی انتہا پر جو ایک نرم ہلکی ہلکی اودا ہٹ تھی وہ شام کے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی اور اس شام کے اندھیرے نے پورے سٹیپی کو اسی طرح ڈھانپ لیا تھا جس طرح موسی موسیوچ کے بچوں کو لحاف نے ڈھانپ رکھا تھا۔

لوے جولائی کی راتوں میں نہیں بولتے۔ بلبل جنگل میں نہیں گایا کرتی اور یہاں پھول بھی نہیں مہکتے۔ پھر بھی سٹیپی۔ بس ایک دلکشی ہے اور زندگی ابلی پڑ رہی ہے جیسے ہی سورج ڈوب جاتا ہے اور دھرتی پر اندھیرا چھا جاتا ہے دن کی ساری تھکن کافور ہو جاتی ہے اور سٹیپی کی فراخ چھاتی ایک لطیف تنفس سے دھڑکنے لگتی ہے جیسے اندھیرے میں سبزے کو یہ دکھائی نہ دیتا ہو کہ اس کا شباب ڈھل چکا ہے سو وہ ایک سرور کے

عالم میں لہلہاتا چہچہاتا دکھائی پڑتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جو دن میں ظاہر نہیں ہوتی۔ نرم چہچہاہٹ، چیں چیں چوں چوں، سیٹی کی مثال تیز لمبی آوازیں، کھٹ کھٹ سُر سُر گویا تیپی سے پھوٹتے ہوئے مدھم سُر، پنچم سُر، درمیانہ سُر۔ یہ آوازیں مل جل کر ایک سدا بہتے لحن کا روپ دھار لیتی ہیں جس بیچ یادوں اور اداسیوں میں محو ہو جانا اچھا لگتا ہے۔

ایک ہی لے ایک ہی سُر میں امنڈتی بہتی جھنکار لوری کی مانند نیند کا جادو جگاتی ہے آنکھیں مندتی چلی جاتی ہیں سواری رواں دواں ہے اور نیند آپ پر چھائی چلی جا رہی ہے۔ لیکن اچانک کسی پھریری لیتے پرندے کی ہنگم سراسیمہ پکار سنائی دیتی ہے یا کوئی مبہم آواز جیسے کوئی حیرت زدہ روح چلا رہی ہے۔ اہا ہا ہا اہا ہا ہا، اور پھر غنودگی سے پلکیں بوجھل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یا آپ کی گاڑی جھاڑیوں کو روندتی چرر مرر کرتی گزر رہی ہے اور اس چڑیا کی جسے تیپی کے پاسی نیند چڑی کہتے ہیں پکار سنائی دیتی ہے، سو رہو سو رہو سو رہو۔ اور ساتھ ہی کوئی دوسرا پرندہ قہقہہ لگاتا ہے یا بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے۔

یہ ہے الو کی آواز۔ اللہ جانے اس سنسان میدان میں یہ پرندے کسے پکارتے ہیں اور کون ان کی سنتا ہے۔ لیکن ان کی پکاریں ہوتا ہے بہت درد، بہت اداسی۔ بھوسے اور سوکھی گھاس اور جاتی رُت کے پھولوں کی باس فضا میں بسی ہوتی ہے لیکن باس میں ایک بوجھل پن ہے، ایک نرمی ہے، ایک خوشگوار سی ناخوشگواری کی کیفیت ہے۔

یوں دھند میں سب کچھ دکھائی دیتا ہے لیکن چیزوں کے رنگ اور خدوخال کا پتہ چلانا دشوار ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنی اصلی شکل سے الگ الگ دکھائی پڑتی ہے آپ گاڑی میں بیٹھے اڑے چلے جا رہے ہیں کہ اچانک سامنے بیچ سڑک پر ایک کالی کالی شکل دکھائی دیتی ہے جیسے کوئی راہب کھڑا ہو۔ وہ شکل ساکت و جامد کھڑی ہے کسی کی راہ تک رہی ہے، ہاتھوں میں کچھ لئے ہوئے ہے . . . . کیا کوئی بیٹ مار ہے۔ شکل قریب آتی جاتی ہے۔ بڑی ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ گاڑی کے بالکل برابر آگئی ہے اور اب آپ پر کھلتا

کہ وہ کوئی آدمی نہیں ہے، اکیلی کھڑی جھاڑی ہے یا کوئی اونچا کھڑا پتھر۔ اس طرح کی ساکت و جامد راہ تکتی شکلیں نیچی پہاڑیوں پر دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی کوئی شکل کسی قدیمی ٹیلے کے پیچھے چھپی دکھائی دیتی ہے، کبھی کوئی شکل اونچی اونچی گھاس میں سے جھانکتی نظر آتی ہے اور یہ سب شکلیں آدمیوں کی مانند دکھائی پڑتی ہیں اور سو سو طرح کے شک پیدا کرتی ہیں۔

اور جب چاند نکل آتا ہے تو رات کا اندھیرا پھیکا پڑ جاتا ہے۔ ہلکا ہو جاتا ہے۔ دھند چھنٹ جاتی ہے۔ ہوا صاف شفاف اور تر و تازہ۔ چاروں سمت ہر چیز صاف دکھائی دے رہی ہے اور تو اور رستے کے کنارے کھڑی گھاس کے ڈنٹھلوں کو بھی ایک دوسرے سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ دور پڑے کنکر پتھر اور ٹھیکرے بھی صاف دیکھے جا سکتے ہیں رات کے اس اجلے پس منظر میں راہبوں کی طرح کی مشکوک شکلیں زیادہ کالی دکھائی دیتی ہیں اور زیادہ ڈراؤنی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک ہی لے ایک ہی سر میں ملنا۔ ہوتی جھنکار کے درمیان کسی بے خواب پاگل پرندے کی حیرت بھری اہلا ہلا۔ یہ پکار اب اور زیادہ سنائی دیتی ہے۔ میدان میں سایوں کے دل اس طرح حرکت میں ہیں جیسے آسمان پر دل بادل امنڈ رہے ہوں اور اگر دور افق کے اس پار آپ دیر تک نظریں جمائے دیکھتے رہیں تو دھندلی عجیب الخلقت شکلیں نمودار ہوتی ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتی دکھائی دیں گی . . . .

کتنی بھید بھری فضا ہے۔ ستاروں سے بھرے ہلکے سبز آسمان پر نگاہ جاتی ہے کہ جس پر کوئی بادل کوئی داغ دھبہ نہیں ہے اور تب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہوا کیوں ٹھہر گئی ہے، فطرت کیوں ٹھٹھکی ہوئی ہے، کیوں ایک ہلکی سی جنبش بھی اس پر بار ہے۔ اسے دھڑکا لگا ہوا ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہو جائے۔ وہ شمہ برابر زندگی بھی ہاتھ سے جانے دینے کو تیار نہیں ہے۔ آسمان کتنی وسعتوں کا حامل ہے، کتنا بے پایاں ہے، اس کا اندازہ دو ہی طرح سے ہو سکتا ہے۔ سمندر کو دیکھ کر یا چاندنی میں سٹیپی کو دیکھ کر۔ کتنا تنہا، کتنا دلکش ایک بلا دینے والی کیفیت ایک سپردگی کا عالم، رجھانے دعوت دینے کا سا انداز کہ آدمی کو

کشمیر آ جائے۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ اور چلئے، آپ کو کوئی قدیم زمانے کا ٹیلہ کھڑا دکھائی دے گا یا پتھروں کا کوئی انبار کہ خدا جانے کس نے کب اور کس مقصد سے اسے لگایا ہوگا۔ رات کا کوئی پرندہ چپ چاپ فضا میں تیر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ کہانیاں جو سنیپی کے متعلق مشہور ہیں یاد آنے لگتی ہیں کوئی کہانی کبھی کسی مسافر نے بیان کی تھی کوئی کہانی کسی بوڑھی نانی دادی نے سنائی۔ ایسی ساری کہانیاں اور کہانیاں ہی نہیں ہر وہ بات جو آپ نے کسی بھلی ساعت میں سنی اور اپنی روح میں اتار لی وہ اُبھر کر حافظہ کی سطح پر آ جاتی ہے اور دل و دماغ میں چکر کاٹنے لگتی ہے پھر یوں ہوتا ہے کہ کیڑوں مکوڑوں کی جھنکار میں قدیم زمانے کے کب کے کھڑے ٹیلوں میں، طائر شب کی پرواز میں، ہر شے میں ہر آواز میں بے پایاں حسن کا، شباب کا، بھرپور توانائی کا، زندگی کی بے پناہ تڑپ کا ایک جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ سوہنی دھرتی کی پکار پر روح جاگ اُٹھتی ہے اور سنیپی کی فضاؤں میں طائر شب کے ساتھ ساتھ پرواز کے لئے تڑپتی ہے اور حسن کے اس عالم سرشاری میں سرور کے اس وفور میں ایک دکھ ایک حسرت کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے، جیسے سنیپی کو اپنی تنہائی کا خیال ستا رہا ہو، جیسے اسے یہ پتہ چل گیا ہو کہ اس کے دامن میں بھری دولت سے دنیا کو کوئی فیض نہیں پہنچ رہا، جیسے اس کا سارا فیضان ساری دولت رائگاں جا رہی ہو کہ نہ اس کے گیت گائے جاتے ہیں نہ کسی کے یہاں اس کی طلب ہے اور اسی کیف و سرور کی ہما ہمی میں یاس و افسردگی میں ڈوبی ایک پکار جیسے یہ دھرتی پکار رہی ہو گیت گانے والو، اے گیت گانے والو۔

"ارے او پاتیلی، کیا حال ہے تیرا۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"ارے تم نے ورملوف صاحب کو دیکھا ہے؟"

"نہیں - وہ تو ہمیں دکھائی دیتے نہیں"

ایگور نُشکا کی آنکھ کھل گئی - دیکھا کہ ٹم ٹم رکی کھڑی ہے۔ دائیں سمت میں گاڑیوں کی قطار سڑک پر دور تک چلی گئی ہے اور ان کے آس پاس کتنے آدمی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چل پھر رہے ہیں - اون کی بڑی بڑی گانٹھوں سے لدی پھندی ہونے کے کارن یہ سب گاڑیاں بہت اونچی اونچی اور بھاری بھرکم دکھائی دے رہی تھیں اس کے برعکس ان میں جتے گھوڑے پستہ قد نظر آرہے تھے، جیسے ان کی ٹانگیں بہت چھوٹی چھوٹی ہوں۔

"اچھا تو پھر ملکان کی طرف چلتے ہیں"، کزمشوف نے اونچی آواز میں کہا۔

"یہودی نے ہمیں یہی بتایا تھا کہ ورلموف صاحب رات کو ملکان میں ٹھہریں گے۔ اچھا جوانو خدا حافظ۔ خوش رہو۔"

"خدا حافظ"،

"ارے جوانو سنو"، کزمشوف نے گرمجوشی کے لہجہ میں کہا

"میرے اس ننھے چھوکرے کو اپنے ساتھ لے لو۔ ہمارے ساتھ وہ آخر کیوں دھکے کھاتا پھرے - ارے او پانتلی تو اسے گانٹھوں پہ بیٹھا دے۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے آتا رہے گا۔ ہم تم لوگوں کو رستے میں آپکڑیں گے۔ ایگور، نیچے اترو۔ چلو۔ جاؤ۔ ٹھیک ہے۔"

ایگور نُشکا باکس سیٹ سے اتر پڑا۔ کتنے ہاتھوں نے اسے تھام کر اونچا اٹھایا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی بڑی سی اور نرم سی جگہ پر جو اوس سے بھیگی بھیگی ہے ٹک گیا ہے۔ اور اب اسے یوں لگا کہ آسمان اس کے بہت قریب آگیا ہے اور زمین کہیں بہت نیچے رہ گئی ہے۔

"ارے، یہ اس کا کوٹ تو لے لو" ونیسکی کہیں بہت نیچے سے چلایا۔

اس کا کوٹ اور ایک پوٹلی نیچے سے اچھل کر اس کے پاس آن پڑی - ایگو نُشکا اس

وقت کسی قسم کا تمدد مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے پوٹلی اپنے سر تلے رکھی اور اوپر سے کوٹ اوڑھ لیا۔ پھر اس نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں لیکن اوس کی نمی محسوس کی تو فوراً ہی ٹانگوں کو سکیڑ لیا۔ پھر اطمینان بھری ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا، سو جاؤ، سو جاؤ، سو جاؤ۔

"خدا حافظ جوانو۔ خدا حافظ" کزمشوف نے پکار کر کہا "مجھے تم پہ بھروسہ ہے"

"ابوپخ صاب، فکر مت کرو"

دنیسکی نے گھوڑوں کو تکتکایا۔ ٹم ٹم نے چرخ چوں کی اور چل پڑی۔ لیکن اب وہ سڑک پر نہیں بلکہ ذرا ہٹ کر کسی اور رستے پہ پڑلی تھی۔ دو منٹ تک بالکل خاموشی چھائی رہی جیسے گاڑیاں سوئی پڑی ہوں۔ نہ کوئی شور نہ کسی قسم کی آواز۔ بس ٹم ٹم کے پیچھے لٹکی گڑولیوں کی کھنکھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ مگر یہ کھنکھناہٹ دھیمی ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ معدوم ہو گئی۔ ٹم ٹم اب دور نکل گئی تھی۔ پھر گاڑیوں کے آگے کھڑے کسی آدمی نے پکار کر کہا "کرو ہارے۔ اب چل پڑ"

سب سے آگے کھڑی گاڑی نے چرخ چوں کی۔ پھر دوسری گاڑی کے پہیوں سے ایسی ہی آواز پیدا ہوئی۔ پھر تیسری سے، پھر چوتھی سے..... ایگورتشکا نے محسوس کیا کہ جس گاڑی میں وہ سوار ہے وہ بھی تھوڑا ہلی ہے اور چرخ چوں کر رہی ہے۔ گاڑیاں چل پڑی تھیں۔ ایگورتشکا نے رسی کو جس سے اون کی گانٹھیں بندھی ہوئی تھیں مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر وہی اطمینان بھری مسکراہٹ۔ اس کی جیب میں جو کیک رکھا ہوا تھا اسے تھوڑا سرکایا اور پھر اطمینان کے ساتھ سو گیا جیسے گھر میں اپنے بستر میں پڑ کر اطمینان سے سو جایا کرتا تھا۔

جب وہ سو کر اٹھا تو سورج نکل آیا تھا۔ اس وقت وہ ایک قدیمی ٹیلے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا اور زمین کو اپنے نور سے نہلا دینے کی سعی میں مصروف تھا۔ اس کی کرنیں چاروں طرف

بکھری ہوئی تھیں اور افق میں یہ کیفیت تھی جیسے پگھلا سونا بہہ رہا ہو۔ ایگورشکا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے سورج اپنی جگہ سے ہٹا ہوا ہے اس لئے کہ کل تو وہ اس کے پیچھے سے نکلا تھا اور آج وہ اس کے بائیں طرف سے نکل رہا ہے .... پورا زمینی منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ پہاڑیاں اب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ چاروں طرف جہاں بھی نظر جاتی تھی۔ بے کیف بھورا بھورا میدان پھیلا ہوا تھا۔ جہاں تہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے کھڑے تھے اور کوے اسی کل والے انداز میں اڑتے پھر رہے تھے۔ دور فاصلہ پر کسی گاؤں کے جھونپڑے اور گھنٹہ گھر سفید سفید نظر آرہے تھے۔ آج چونکہ اتوار کا دن تھا۔ اس لئے کوچک روس کے باسی آج گھروں ہی میں تھے اور ریند ھنے پکانے میں لگے ہوئے تھے۔ سو ہر گھر کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس دھوئیں سے پورے گاؤں پر ایک گہری نیلی شفاف چادر سی تن گئی تھی۔ ان جھونپڑوں اور گرجا گھر کے درمیان ایک نیلی نیلی دھاری کی صورت کسی ندی کی جھلک دکھائی پڑ رہی تھی اور ندی سے پرے پھیلے فاصلے ایک دھند میں گم تھے لیکن کل کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بدلی ہوئی جو چیز نظر آرہی تھی وہ سڑک تھی۔ ویسے سڑک نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی بس ایک بے تحاشا وسیع وعریض رستہ تھا کہ پورے سٹیپی میں پھیلا نظر آتا تھا۔ یہ ایک مٹیالی پٹی تھی کہ بہت روندی گئی تھی اور جس طرح سڑکیں گرد میں اٹی ہوتی ہیں وہ بھی گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ مگر اس کی چوڑائی نے ایگورشکا کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اسے جنوں پریوں کی کہانیاں یاد آرہی تھیں۔ اس رستے پہ کون چلتا ہوگا۔ کسے چلنے کے لئے اتنا لمبا چوڑا رستہ چاہیئے۔ حیرت، تعجب۔ دیو ہی اس رستے پہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلتے ہوں گے۔ شاید الیا مرومت اور سولوی ڈاکو روس میں ابھی تک بھرتے پھر رہے ہیں اور ابھی تک ان کے کوہ قامت گھوڑے زندہ وموجود ہیں۔ ایگورشکا نے کچھ یوں تصور باندھا کہ آدھی درجن بڑے بڑے اونچے اونچے رتھ اس رستے پہ برابر برابر دوڑتے ہوئے مقابلہ کی دوڑ دوڑتے ہوں گے۔ ویسے رتھ جیسے اس نے توریت انجیل کی تصویروں

میں دیکھے تھے رتھ جن میں چھ چھ تڑپتے مچلتے گھوڑے جتے ہوتے تھے اور جن کے بڑے بڑے پہیوں سے وہ گرد اٹھتی تھی کہ آسمان کو جا چھوتی تھی اور ان گھوڑوں کو ہانکنے والے، بس ویسے جیسے خوابوں میں دکھائی دیتے ہیں یا جنوں پریوں کی کہانیوں پر سوچ بچار کے عالم میں تصور میں ابھرتے ہیں اور اگر ایسی مخلوقات کا کوئی وجود ہے تو تبتی اور اس کا یہ رستہ ان کے لئے کتنا موزوں ہے۔

ٹیلی گراف کے کھمبے دو دو تاروں والے، رستے کی دائیں طرف حدِ نگاہ تک چلتے چلے گئے تھے۔ فاصلے کے ساتھ وہ چھوٹے ہوتے ہوتے گاؤں کے قریب جا کر جھونپڑوں اور ہرے بھرے درختوں کے ہجوم میں چھپ گئے تھے اور وہاں سے نکل کر اودی اودی دوریوں میں پھر دکھائی دینے لگے تھے مگر اب وہ اتنے چھوٹے اتنے پتلے لگ رہے تھے جیسے زمین میں پنسلیں گڑی ہوں۔ تاروں پہ چیلیں کوے باز بیٹھے تھے اور گزرتی گاڑیوں کو بہت بے تعلقی سے دیکھ رہے تھے۔

ایگورشکا سب سے پچھلی گاڑی میں لیٹا تھا اور اس لئے وہ پوری قطار کو دیکھ سکتا تھا۔ کم و بیش بیس گاڑیاں تھیں۔ ہر تین گاڑیوں پر ایک گاڑی بان تعینات تھا۔ اس آخری گاڑی کے ساتھ ساتھ جس میں ایگورشکا تھا ایک بوڑھا شخص چل رہا تھا جس کی سفیدی مائل چکیلیا ڈاڑھی پادری کرسٹفر کی ڈاڑھی کی طرح کی تھی مگر چہرہ سنولایا ہوا، تنا ہوا، اور سوچتا ہوا سا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہ یہ تناؤ کی کیفیت ہو نہ کسی گہری سوچ میں غلطاں ہونے کی صورت ہو، بلکہ اس کی لال لال آنکھوں نے اس کی لمبی ستواں ناک نے اس کے چہرے پر ایک تناؤ ایک سرد مہری کی کیفیت پیدا کر دی، جو جیسی ان لوگوں کے چہرے پر عموماً نظر آتی ہے جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھے گمبھیر مسائل کے بارے میں مستقل سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔ پادری کرسٹفر ہی کی طرح اس نے ایک چوڑے کناروں والا ٹاپ ہیٹ سر پہ جما رکھا تھا لیکن وہ شرفا والا ٹاپ ہیٹ نہیں تھا۔ بھورے رنگ کا

فیلٹ ہیٹ تھا اور جس کی شکل کسی قدر مخروطی تھی۔ اس طور چل رہا تھا کہ اپنی ران پہ ہاتھ
مارتا جاتا تھا اور پیر دھمکتا جاتا تھا۔ شاید یہ عادت اسے اس طرح پڑی تھی کہ کڑکڑاتے
جاڑوں میں گاڑیوں کے ساتھ چلتے چلتے جب وہ ٹھنڈا برف ہو جاتا تھا تو یہی کچھ کرتا تھا
اس نے دیکھا کہ ایگوزتسکا جاگ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر بولا اور ساتھ ہی ہیں کاندھے اس طرح سکیڑے
جیسے سردی لگ رہی ہو۔

"ارے بچو، تم جاگ رہے ہو۔ تو تم الیوان ایویچ کے بیٹے ہو؟"

"نہیں۔ ان کا بھانجا ہوں"

"الیوان ایویچ کے بھانجے ہو؟ مجھے دیکھو میں نے جوتے اتار لئے ہیں اور ننگے
پیروں اچھلتا کودتا چل رہا ہوں۔ میرے پیروں کی بری حالت ہے۔ سوج
گئے ہیں۔ سو بغیر جوتوں کے چلنے میں آسانی رہتی ہے۔ بچو اس میں زیادہ
آسانی ہے........ میرا مطلب ہے جوتوں کے بغیر...... تو تم
الیوان ایویچ کے بھانجے ہو؟ بھلا آدمی ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو نقصان
نہیں پہنچتا...... میرا مطلب الیوان ایویچ سے ہے....... وہ
ملکان کی طرف گیا ہے...... یارب ہم پہ رحم کر"

بوڑھا ایسے بول رہا تھا جیسے کڑکڑاتا جاڑا پڑ رہا ہو۔ بیچ بیچ میں رکتا تھا اور پورا
منہ نہیں کھول رہا تھا۔ شفتی حروف صحیحہ کا تو تلفظ ہی غلط کر رہا تھا۔ ان حروف کو ادا
کرتے ہوئے ہکلانے لگتا تھا جیسے جاڑے سے ٹھنخ ہو رہا ہو۔ ایگوزتسکا سے باتیں کرتے
ہوئے نہ تو مسکرایا ہو۔ وہی تناؤ کی سی کیفیت۔

ان سے دو گاڑی آگے جو شخص چل رہا تھا اس نے لمبا سا سرخی مائل بھورا کوٹ پہن
رکھا تھا۔ سر پہ کیپ، پیروں میں فل بوٹ، ہاتھ میں چابک۔ یہ کوئی بوڑھا آدمی نہیں
تھا۔ چالیس کے پیٹے میں ہوگا۔ جب اس نے مڑ کر پیچھے نظر ڈالی تو ایگوزتسکا نے دیکھا کہ ایک

بلسوتر الال لال چہرہ ہے، ڈاڑھی بکرے کی سی، اور دائیں آنکھ کے نیچے کا حصہ سوجھا ہوا ہے اور سپنج کی سی شکل کا ہے۔ اس نہایت بدنما سوجھن سے قطع نظر اس میں ایک اور نرالی بات تھی کہ جس پہ فوراً نظر جاتی تھی۔ الٹے ہاتھ میں چابک تھا اور سیدھے ہاتھ کو اس طرح جنبش دے رہا تھا جیسے حمد گانے والی کسی ٹولی کو ہدایات دے رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد چابک کو بغل میں دبا لیتا اور پھر دونوں ہاتھوں کو جنبش دے کر ہدایات دیتا اور ساتھ میں کچھ گنگناتا جاتا۔

دوسرا اگاڑی بان لمبا سیدھا خط مستقیم کی طرح تھا۔ کاندھے بالکل جھکے ہوئے اور پیٹھ بالکل تختہ۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل سیدھا بس اس طرح اکڑا رکھا تھا جیسے وہ مارچ کر رہا ہو یا جیسے اس نے گز نگل لیا ہو۔ چلتے ہوئے اس کے بازو ہل نہیں رہے تھے۔ بس ایسے لٹکے ہوئے تھے۔ جیسے سیدھی چھڑیاں ہوں۔ چلتے ہوئے لکڑی سا لگ رہا تھا۔ جیسے سپاہی کا پتلا چل رہا ہو، ایسے ہی بالکل سیدھا، گھٹنے کو ذرا بھی خم دیئے بغیر چل رہا تھا اور لمبے سے لمبا ڈگ بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جتنی دیر میں بوڑھا اور سپنج جیسی سوجھن والا دو ڈگ بھرتے تھے یہ شخص ایک ڈگ بھرتا تھا۔ سو لگ یہ رہا تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں آہستہ چل رہا ہے اور پیچھے رہ جائے گا۔ اس نے منہ پہ ایک پٹی لپیٹی ہوئی تھی۔ سر پہ راہبوں والی چوٹی دار ٹوپی کی طرح کی کوئی چیز منڈھی ہوئی تھی۔ بر میں کوچک بُوس والا چھوٹا کوٹ، گہرے نیلے رنگ کا پائجامہ، کھال کے بنے بوٹ۔

جو زیادہ آگے تھے ان کی ایگور شناخت نہیں کر سکا۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا تھا گانٹھ کے اندر ایک ننھا سا سوراخ بنا لیا تھا کرنے کے لئے اور کچھ تو تھا نہیں، اس نے اون کو مروڑ مروڑ کر سُتلی بٹنی شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ نیچے بوڑھا شٹم پشٹم چل رہا تھا۔ دیکھنے میں جیسا تند مزاج نظر آتا تھا پتہ چلا کہ ویسا نہیں ہے۔ ایک دفعہ شروع ہو گیا تو اب بند ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"تم جا کہاں رہے ہو؟" پیر پٹختے ہوئے اس نے پوچھا۔

"سکول۔" ایگور تسکا نے جواب دیا۔

"سکول ہے۔ اچھا۔ اوپر والا تمہاری مدد کرے۔ ہاں ٹھیک ہے ایک دماغ بھی اچھا ہوتا ہے دو ہوں تو واہ واہ رب کسی ایک کو بس ایک دماغ دیتا ہے کسی کو دو بخش دیتا ہے کسی تیسرے کو تین عطا کر دیتا ہے بالکل ٹھیک .... ایک دماغ تو ہم جنم لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک دماغ پڑھنے لکھنے سے ملتا ہے تیسرا نیک زندگی گزارنے سے حاصل ہوتا ہے تو میرے بچے اگر آدمی کے پاس تین دماغ ہوں تو کتنی اچھی بات ہے اس کے لئے جینا بہت آسان ہو جاتا ہے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ ہاں مرنا بھی ..... اور مرنا تو بے شک ہم سب ہی کو ہے۔"

بوڑھے نے ماتھا کھجایا، اوپر نظر ڈال کر لال لال آنکھوں سے ایگور تسکا کو دیکھا اور پھر جاری ہو گیا۔

"میکسم نکولائچ جو سلاویانوزبرگ کا رہنے والا ہے وہ بھی ایک ننھے سے لڑکے کو سکول میں داخل کرانے کے لئے پچھلے برس لایا تھا۔ اب یہ تو مجھے پتہ نہیں کہ پڑھائی میں وہ کیسا چل رہا ہے لیکن تھا وہ بہت اچھا بہت پیارا بچہ..... رب ان کی مدد کرے بھلے لوگ ہیں۔ ہاں وہ بھی اپنے لڑکے کو سکول میں داخل کرانے کے لئے لایا تھا۔ سلاویانوزبرگ میں مجھے لگتا ہے کہ کوئی سکول نہیں ہے مگر بستی بہت خوب ہے۔ .... غریب غربا کے لئے کوئی چھوٹا موٹا سکول تو ہے۔ لیکن کوئی آگے پڑھنا چاہے تو کوئی ایسا سکول نہیں ہے۔ سچی بات ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"ایگور تسکا۔"

"ایگوری۔ پاک شہید حامل فتح ایگوری۔ ان کا یوم شہادت ۲۱ اپریل کو پڑتا ہے۔

اور میرا نام ہے پانتلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانتلی زہر دف ہولدوف ۔ ہم لوگ ہولدوف قبیلہ
سے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں رہنے والا ، شاید تم نے اس بستی کا نام سنا ہو ، تم جو صوبہ
کرسک میں ہے تو میں تم کا رہنے والا ہوں ۔ میرے بھائی دستکار ہیں اور اسی
قصبہ میں کاروبار کرتے ہیں ۔ لیکن میں کسان ہوں ۔ کسان ہی چلا آتا ہوں ۔ سات
برس ہوئے میں وہاں گیا تھا ۔ اپنے گھر میرا مطلب ہے کہ اس قصبہ میں اور اس
گاؤں میں ۔ میرا مطلب تم سے ہے اللہ کا شکر ہے سب جیتے تھے اور راضی خوشی
تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب کا مجھے پتہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک
لڑھک گئے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا وقت تو ویسے آچکا ہے ۔ اس لئے کہ ان میں
کئی ایک مجھ سے زیادہ عمر والے ہیں موت تو برحق ہے ۔ بس یہ ہے کہ آدمی کو توبہ
کر کے مرنا چاہیئے ۔ توبہ کر کے آدمی مرے تو موت میں کیا ہرج ہے ۔ ہاں توبہ کئے
بغیر مرنا ، اس سے بری موت اور کوئی نہیں ہو سکتی ۔ اس پر شیطان خوش ہوتا ہے
اگر توبہ کی موت مرنا چاہتے ہو کہ سیدھے جنت میں جاؤ تو شہید پاک واردیرا
سے دعا مانگنی چاہیئے ۔ وہ پاک بی بی شفاعت کرے گی ۔ وہ بی بی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہاں بلاشبہ ۔ ۔ ۔ ۔ خداوند نے اس نیک بی بی کو جنت میں وہ مقام عطا کیا
ہے کہ ہر آدمی اپنی توبہ کی قبولیت کے لئے اس سے دعا کر سکتا ہے ۔"

پانتلی بولتا بڑبڑاتا رہا ، اس بات سے بے پرواہ کہ ایگور شکا اس کی باتیں سن رہا ہے یا نہیں ۔ وہ اپنی موج میں بولے چلا جا رہا تھا ۔ بڑبڑا رہا تھا ایک ہی لہجہ میں نہ آواز اونچی ہوتی تھی نہ نیچی پڑتی تھی ۔ لیکن اس نے اسے تھوڑے وقت میں بہت کچھ سنا دیا تھا ۔ ویسے وہ ساری بے ربط گفتگو تھی ۔ کسی ایک بھی بات کا کسی دوسری بات سے جوڑ نہیں ملتا تھا ۔ سب انمل بے جوڑ ۔ اور پھر ایگور شکا کے لئے اس میں کوئی دلچسپی کا پہلو نہیں تھا ۔ شاید وہ یہ سوچ کر بول رہا تھا کہ پوری رات چپ رہ کر گزارنی ہے ۔ اونچی آواز میں بول کر اپنے خیالات

کا حساب کتاب کر لیا جائے، دیکھ لیا جائے کہ وہ سب اپنی جگہ موجود بھی ہیں۔ توبہ واستغفار کا ذکر کرنے کے بعد اس نے پھر میکسم نکولا ئیچ نام کے شخص کا ذکر شروع کر دیا۔

" ہاں تو وہ اپنے چھوکرے کو لے کر آیا تھا...... بالکل...... صحیح کہہ رہا ہوں۔"

آگے چلنے والے ایک گاڑی بان نے اچانک چھلانگ لگائی۔ رستے سے ہٹ کر ایک طرف لپکا اور زمین پہ چابک برسانے شروع کر دیئے۔ ہٹا کٹا، چوڑا چکلا، سن کی طرح کے گھنگھریالے بال، نیس کے پیٹے میں ہوگا۔ کاٹھی بتا رہی تھی کہ تگڑا آدمی ہے جس طریقے سے اس کے شانے ہل رہے تھے اور چابک برس رہا تھا اور جو انہماک اس کے یہاں نظر آ رہا تھا اس سے یہ لگتا تھا کہ وہ کسی زندہ چیز کو مار رہا ہے۔ ایک دوسرا گاڑی بان، ناٹا قد، گٹھا ہوا بدن، جھاڑ جھنکار ڈاڑھی، بریں واسکٹ اور قمیص جو پتلون سے باہر نکلی ہوئی تھی لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ زور کا قہقہہ لگایا اور کھنکھارتے ہوئے بولا:

" ابے جوانو یہاں آؤ، دیکھو، وا ئموف نے سانپ مارا ہے۔"

کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ ان کی آواز اور قہقہہ سنتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی کتنی بڑھی ہے۔ یہ کالی ڈاڑھی والا آدمی اسی قبیل سے تھا۔ ان نصیب وروں میں سے جن کی آواز چغلی کھاتی ہے کہ حماقت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بس ایسے سروالا وا ئیموف قصہ نبٹا چکا تھا۔ ڈوری ایسی چیز اس نے زمین سے چابک پہ اٹھائی اور ہنستے ہوئے گاڑی کے اندر پھینک دی۔

" یہ زہریلا نہیں تھا۔ یہ تو گھاس والا سانپ تھا"، کسی نے اونچی آواز میں کہا

مکڑی کی سی چال والا آدمی جس کے چہرے کے گرد پٹی بندھی ہوئی تھی لمبے لمبے ڈگ بھر کر جلدی سے مرے ہوئے سانپ کے قریب پہنچا، غور سے اسے دیکھا اور اپنے مکڑی جیسے بازوؤں کو جھٹکا۔

"ابے او چیل کے بچی" اس نے فریادی لہجہ میں چیخ کر کہا
"تو نے بے چارے گھاس کے سانپ کو مار ڈالا۔ آخر کیوں۔ ابے موذی اجڈ۔
اس نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ اے یارو، ذرا دیکھو تو سہی۔ اس نے بے چارے
گھاس کے سانپ کو مار ڈالا۔ اگر تمہارے ساتھ ایسا ہو تو کیسا ہو، ذرا سوچو"
"گھاس کے سانپ کو نہیں مارنا چاہیئے۔ سچی بات ہے" پانتلی نے دھیرے سے کہا
"انہیں نہیں مارنا چاہیئے۔ ویسے تو وہ سانپ ہی کی طرح کے ہوتے ہیں، مگر
زہری نہیں ہوتے۔ بہت شریف معصوم مخلوق ہے۔ آدمی کا دوست ہوتا
ہے۔ یعنی گھاس والا سانپ"

وائیموف اور کالی ڈاڑھی والا آدمی، دونوں شاید کچھ پشیمان تھے کیونکہ وہ کسی بات کا جواب نہیں دے رہے تھے، زور زور سے ہنسے جا رہے تھے۔ پھر سر نیوڑھائے نیچی نظر بن کئے چپکے سے اپنی گاڑیوں کی طرف ہو لئے۔

جب سب سے پیچھے والی گاڑی اس جگہ کے برابر آئی۔ جہاں سانپ مرا پڑا تھا تو جس آدمی کے چہرے کے گرد پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں ٹھٹھک گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پانتلی سے مخاطب ہوا۔

"دادا، آخر وہ چاہتا کیا تھا کہ اس نے بے چارے گھاس والے سانپ کو مار ڈالا"

اور اب ایگور شکا نے دیکھا کہ اس آدمی کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور میلی میلی ہیں۔ اس کا چہرہ پیلا بیماروں کا جیسا تھا اور کچھ ملگجا سا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ٹھوڑی اس کی سرخ ہو رہی تھی اور کچھ سوجی ہوئی بھی تھی۔

"دادا، اس نے آخر اسے مارا کیوں" ایک مرتبہ پھر پانتلی کے برابر سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی بات کو دہرایا۔

" احمق آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ مارنے کے لئے کھجلاتے رہتے ہیں۔ بس اس کارن وہ ایسی حرکت کرتا ہے " بوڑھا آدمی کہنے لگا:

" مگر اسے گھاس والے سانپ کو واقعی نہیں مارنا چاہئے تھا۔ بالکل صحیح بات ہے ...... وائیموف بہت بدذات ہے کون نہیں جانتا اسے۔ جو چیز سامنے آجائے کمبخت اسے مار ڈالتا ہے اور کروہانے بھی اسے نہیں روکا۔ اسے روکنا ٹوکنا چاہیئے تھا۔ مگر بجائے روک ٹوک کرنے کے وہ ہا ہا ہو ہو کر رہا تھا ....

مگر واسیا، جانے دے، غصہ تھوک دے۔ انہوں نے اسے مارا، خیر کوئی بات نہیں۔ دل برا نہیں کرنا چاہیئے۔ وائیموف تو ہے ہی بدذات اور کروہانے جو کیا یہ اس کی حماقت تھی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ... دونوں گدھے ہیں عقل تو انہیں چھو کر نہیں گئی۔ لیکن خیر۔ ان کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دینا چاہیئے۔ ایمیلیان کو دیکھو، جس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیئے اس میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالتا ...... کبھی جو ہاتھ ڈال جائے ..... صحیح بات ہے .....

اس لئے کہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ یہ دونوں تو جاہل اجڈ ہیں ....

ایمیلیان .... وہ تو کبھی ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہی نہیں "

جس گاڑی بان نے سرخی مائل بھورا کوٹ پہن رکھا تھا اور جس کا چہرہ سپنج کی طرح پھولا ہوا تھا اور جو ایک ان دیکھی حمد گانے والی پارٹی کو ہدایات دے رہا تھا وہ بھی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا نام سن لیا تھا جب پانتلی اور واسیا اس کے قریب آگئے تو وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بھاری پھنسی پھنسی آواز میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

" آپ لوگ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں "

" واسیا کو غصہ آیا ہوا ہے " پانتلی بولا۔

"میں اسے سمجھا رہا ہوں کہ غصے کو جانے دے .... اُف میرے سوجھے ہوئے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ اُف، اُف۔ اتوار کے دن سے تو بہت ہی سوجھ گئے ہیں۔ اے خداوند رحم کر۔"

"یہ چلنے سے ہوا ہے"، واسیا بولا۔

"نہیں بچہ نہیں۔ چلنے سے یہ نہیں ہوا۔ چلنے میں تو تکلیف کم ہوتی ہے۔ جب بستر میں لیٹتا ہوں اور بدن میں ذرا گرمائی آتی ہے پھر مت پوچھو کیا حالت ہوتی ہے۔ چلنے میں مجھے تکلیف کم ہوتی ہے۔"

ایمیلیان اپنا سرخی مائل بھورا کوٹ ڈاٹے پانتلی اور واسیا کے درمیان چل رہا تھا۔ بازوؤں کو ہلاتا جاتا تھا جیسے یہ دونوں ابھی حمد شروع کرنے والے ہیں۔ بازوؤں کو تھوڑی دیر جنبش دینے کے بعد اس نے انہیں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مری ہوئی سی آواز میں بولا۔

"میری آواز نہیں ہے۔ بڑی بد نصیبی کی بات ہے کل ساری رات اور آج صبح وہ گیت 'یا رب تو کرم کر دے'، جو مارینو وسکی کی شادی میں گایا گیا تھا میرے دل و دماغ میں گونجتا رہا۔ میرے دماغ میں میرے گلے میں بسا ہوا ہے لگتا ہے کہ میں یہ گیت گا سکتا ہوں۔ مگر نہیں گا سکتا۔ میری آواز ہی نہیں ہے۔"

دم بھر کے لئے رکا، سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر کہنے لگا۔

"میں پندرہ برس تک حمدیں گانے والوں کی سنگت میں رہا ہوں پوری لوگالسکی میں میری جیسی آواز کسی کے پاس نہیں تھی۔ مگر برا ہو اس دن کا جب، یہ دو برس پہلے کی بات ہے کہ میں دونیز ندی میں نہا لیا۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن گلے سے سر ہی نہیں نکلتا گلے کو ٹھنڈ لگ گئی اور آواز کے بغیر میرا حال اس دستکار کا سا ہے جس کے ہاتھ جاتے رہے ہوں۔"

"یہ صحیح ہے"، پانتلی نے تائیدی لہجہ میں کہا۔

" مجھے اپنے متعلق بس ایک احساس ستاتا رہتا ہے کہ میں برباد ہو گیا"
اسی آن واسیا کی نظر ایگورشکا پر جا پڑی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں چھوٹی چھوٹی تو تھیں ہی اور چھوٹی دکھائی دینے لگیں۔
" ہمارے ساتھ یہ ننھے میاں بھی گاڑی ہانک رہے ہیں" اور اس نے ناک کو آستین میں دھنسا لیا جیسے شرمندہ ہو گیا۔
" کیا کہنے ہیں گاڑی بان میاں کے۔ ننھے میاں، ہمارے ساتھ رہو۔ گاڑی بان بن جاؤ گے اور اون بیچا کرو گے"
اتنا چھوٹا سا بچہ اور گاڑی بان، یہ اتصل اسے عجب اور مضحکہ خیز معلوم ہوئی کہ اس نے ٹھٹھے لگانے شروع کر دیئے اس خیال پر اس نے کیا کیا حاشیہ آرائی کی۔ ایمیلیاں نے بھی اوپر نگاہ ڈالی اور ایک نظر ایگورشکا کو دیکھا مگر بڑے سرسری سے انداز میں اور بہت سرد مہری سے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں غرق تھا۔ وہ تو واسیا کا دل رکھنا تھا ورنہ وہ تو ایگورشکا کو آنکھ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔ پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ اس نے پھر بازوؤں کو ہلانا شروع کر دیا اور وہ جو شادی والا گیت ع

یا رب تو کرم کر دے

اسے رات بھر یاد آتا رہا تھا۔ اب اس نے اپنے ساتھیوں کو اس کی شاعرانہ خوبیاں سمجھانی شروع کر دیں اس نے چابک بغل میں دبایا اور دونوں ہاتھوں کو گھمانا شروع کر دیا۔
گاؤں کوئی ایک میل ہو گا کہ گاڑیاں ایک کنوئیں کے پاس جا کر رک گئیں۔ کنوئیں کے ساتھ کریں لگی ہوئی تھی۔ سیاہ ڈاڑھی والے کروہانے کنوئیں میں ڈول ڈالا اور کنوئیں کی من پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اس طرح کہ اس کا چھپرا سر، اس کے شانے، اس کی چھاتی سب کنوئیں کے اندر جھک گئی۔ ایگورشکا کو اب بس اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں اور ان کی کیفیت بھی یہ تھی کہ وہ زمین سے نہیں لگ پا رہی تھیں۔ کروہانے

کنوئیں کی تہہ میں اپنے سر کی پرچھائیں دیکھی تو بہت خوش ہوا۔ ترنگ میں آکر اپنی بھاری آواز میں احمقانہ سا ایک قہقہہ مارا۔ کنوئیں کے اندر سے ایک گونج سنائی دی کہ اس قہقہہ کا جواب تھی۔ جب وہ وہاں سے اٹھا تو اس کا گلا اور اس کا چہرہ دونوں لال چقندر بنے ہوئے تھے۔ جس نے دوڑ کر سب سے پہلے پانی پیا وہ وائیمون تھا۔ وہ ہنس رہا تھا اور پانی پی رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ڈول سے منہ ہٹا کر کرواہے سے کچھ کہتا۔ بس کوئی مسخرے پن کی بات۔ پھر اس نے ارد گرد نظر ڈالی اور چلا کر اونچی آواز میں پانچ بہت گندے سے لفظ بولے۔ اتنی چلا کر کہ بستی کا ہر آدمی سن لے۔ ایگورشکا ان لفظوں کا مطلب تو نہیں سمجھتا تھا مگر اتنا جانتا تھا کہ یہ گندے لفظ ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس قسم کے لفظ سن کر اس کے دوستوں اور عزیزوں کو کتنی کراہت ہوتی ہے، اگرچہ منہ سے وہ کچھ نہیں کہتے۔ وہ خود بھی یہ جانے بغیر کہ ان لفظوں کا کیا مطلب ہے انہیں سن کر اسی طرح کراہت محسوس کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صرف نشہ باز اور لچے لفنگے ان لفظوں کے آزادانہ استعمال کو روا جانتے ہیں۔ اسے گھاس والے سانپ کا مارا جانا یاد آگیا۔ اس کیفیت میں اس نے وائیموں کے ٹھٹھے سنے اور اس کے اندر اس شخص کے خلاف ایک نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ قسمت کی خرابی کہ عین اسی گھڑی وائیمون کی نظر ایگورشکا پر جا پڑی۔ جواب گاڑی سے نیچے اُتر آیا تھا اور کنوئیں تک پہنچ گیا تھا۔ وائیمون ہنسا اور اونچی آواز سے بولا۔

"ارے یارو دیکھو، بڈھے نے رات رات میں ایک بچہ جن دیا۔"

کرواہا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ ایک دوسرے کو بھی ہنسی آگئی ادھر ایگورشکا کا یہ حال کہ منہ لال ہوگیا۔ اس نے دل ہی دل میں قطعی انداز میں طے کیا کہ وائیمون بہت بدآدمی ہے۔

گھنگھریالے سن کی طرح کے بال، ہیٹ ندارد، قمیص کے بٹن سینے تک کھلے ہوئے،

اس جلیبر میں دائیموف بہت جیالا اور تکڑا نظر آرہا تھا۔ اس کی ہر نقل و حرکت اس کے
نڈر پن کی، اس کی پہلوانی شان کی چغلی کھا رہی تھی۔ اور اسے خود بھی اس کا احساس تھا
اس نے کاندھے مچکائے اور کولہوں پہ ہاتھ رکھ کر سب ساتھیوں سے بڑھ کر اونچی آوازیں
بولنے اور قہقہے لگانے لگا۔ اس کے تیوروں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی ایک ہاتھ سے
کوئی بھاری چیز اُٹھائے گا اور دنیا کو حیران کر دے گا۔ اس کی شرارت اور تمسخر سے بھری
نظریں بھٹک کر کبھی سڑک پہ جاتیں کبھی گاڑیوں پہ، کبھی آسمان پر۔ کسی جگہ ٹک نہیں پا رہی
تھیں۔ جیسے کسی شکار کی تلاش میں ہوں کہ اسے مارا جائے کسی خاص وجہ سے نہیں، بس دل لگی
کی خاطر، وقت گزاری کی خاطر۔ یہ تو ظاہر ہی تھا کہ اسے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ نہ کسی بات
کا پابند ہے اور یہ خیال تو خیر کیوں آتا کہ ایگورشکا اس کے بارے میں کیا سوچے گا۔

.... ادھر ایگورشکا اس کی صورت سے، اس کے سن ایسے بالوں سے،
اس کے مسٹنڈے پن سے سخت متنفر ہو چلا تھا۔ ڈرا سہما سا ایک بیزاری کے عالم میں
وہ اس کی ٹھٹھے بازیاں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس گالی سے اس کا جواب دیا جائے۔

پانتلی بھی ڈول کے پاس پہنچا۔ جیب سے ایک ہرے رنگ کا گلاس نکالا۔ یہ
گلاس ایک چراغ کی شبیہ کی طرح کا تھا۔ اس نے کپڑے سے اسے صاف کیا، ڈول سے
اس میں پانی بھرا اور پی گیا۔ پھر بھرا۔ کپڑے میں اسے لپیٹا اور جیب میں رکھ لیا۔

ایگورشکا نے حیران ہو کر پوچھا "دادا، تم پانی چراغ سے کیوں پیتے ہو"

"کوئی ڈول سے پانی پیتا ہے کوئی چراغ سے پیتا ہے" بوڑھے نے ٹلتے ہوئے جواب دیا۔
"اپنی اپنی پسند کی بات ہے.......... تم ڈول سے پانی پیتے ہو اچھا
تو پیو۔ خدا تمہیں مبارک کرے۔"

"تم کتنی پیاری کتنی موہنی ہو" اچانک واسیا بول اٹھا۔ اس کی آواز میں ایک
پیار کی اور کچھ رقت کی سی کیفیت تھی "میری موہنی"

اس کی نگاہیں دور کہیں جا کر جم گئی تھیں ان میں نمی تھی اور مسکراہٹ اور اس کے

چہرے پہ وہی کیفیت تھی جو ایگورتسکا کو دیکھنے پہ طاری ہوئی تھی۔

"کون ہے جس سے باتیں کر رہے ہو" کروہا نے پوچھا۔

"پیاری لومڑی سے۔۔۔۔۔۔ چت لیٹی ہے اور جیسے کتا کھیلتا ہے۔ ویسے کھیل رہی ہے۔"

ہر ایک کی نظریں دور فاصلوں میں بھٹکنے لگیں نظریں لومڑی کو تلاش کر رہی تھیں وہ کسی کو نظر نہ آئی۔ سوائے واسیا کے جس کی بھوری مرٹ میلی نظروں نے اسے تاڑ لیا تھا اس پہ تو ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ ایگورتسکا کو بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی نظر تو ہے ہی بہت تیز۔ غیر معمولی حد تک تیز۔ اس کی نظریں اتنی دور تک دیکھ سکتی تھیں کہ سٹیپی کا وہ بھورا بھورا میدان اسے ہمیشہ زندگی سے بھرا پرا دکھائی دیتا تھا۔ دور نگاہ کے دوڑانے کی دیر تھی۔ خیر کوئی لومڑی۔ کوئی خرگوش، کوئی تلہور یا کوئی بھی ایسا جانور جو آدمی سے بدکتا ہے۔ اسے دکھائی دے جاتا ویسے تو کسی دوڑتے خرگوش کو یا اڑتی ہوئی تلہور کو دیکھ لینا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی سٹیپی سے گزرتے ہوئے ہر کوئی یہ منظر دیکھ سکتا ہے لیکن وحشی جانوروں کو اس عالم میں دیکھنا کہ نہ بھاگ دوڑ میں ہوں نہ لپتے چھپتے پھر رہے ہوں نہ چوکنے ہو کر ادھر اُدھر دیکھ رہے ہوں بلکہ اپنے کچھاروں، اپنے ٹھکانوں پہ مگن بیٹھے ہوں، یہ ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا، واسیا کو کیا کیا منظر دکھائی دیتے تھے۔ لومڑیاں کھیل رہی ہیں۔ خرگوش اپنے پنجوں سے اپنی کھال کو مل رہے ہیں اور نہا رہے ہیں تلہوریں اپنے پروں کو جھاڑ رہی ہیں صاف کر رہی ہیں۔ سب کی دیکھی بھالی۔ دنیا کے علاوہ واسیا کی اپنی ایک الگ دنیا بھی تھی۔ اس دنیا میں کسی دوسرے کی رسائی نہیں تھی اور شاید یہ دنیا بہت ہی خوبصورت تھی کہ جب وہ اس کا مشاہدہ کرتا اور ترنگ میں آ جاتا تو اس پر آدمی رشک نہ کرتے یہ ناممکن تھا۔

جب گاڑیوں نے دوبارہ اپنا سفر شروع کیا تو گرجا گھر میں سروس کے لئے گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئی تھیں۔

(۵)

گاڑیوں کی قطار ندی کے کنارے کنارے جس کے ایک طرف کوئی گاؤں تھا چلی جا رہی تھی۔ کل کی طرح آج بھی سورج آگ برسا رہا تھا۔ ہوا بند تھی۔ ندی کنارے جہاں تہاں کچھ بید مجنوں کے پیڑ کھڑے تھے۔ لیکن ان کی چھاؤں زمین پر تو پڑ نہیں رہی تھی، ندی کے پانی پر پڑ رہی تھی۔ وہاں تو اسے ضائع ہی ہونا تھا۔ گاڑیوں کے سائے میں بھی پناہ نہیں تھی۔ دم گھٹا جا رہا تھا اور بیزاری کی سی کیفیت تھی۔ آسمان کے عکس سے ندی کا پانی نیلا نیلا دکھائی دے رہا تھا اور عجب دلفریب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

ایک گاڑی بان پر اگور نسکا کی نظر اب پڑی۔ یہ سٹیوپک تھا، کوچک، روس کا رہنے والا، سن یہی کوئی اٹھارہ برس، بدن پر لمبی نیچی قمیص پیٹی کے بغیر، چوڑی موری والا پائجامہ کہ چلتے ہوئے اس کے پائنچے پرچموں کی طرح پھڑ پھڑ کرتے۔ جھٹ پٹ اس نے کپڑے اتارے ڈھلوان کنارے پر اترے بھرتا ہوا چلا اور ندی میں چھلانگ لگا دی۔ تین ڈبکیاں لیں۔ پھر چت ہو کر تیرنے لگا اور سرور کے عالم میں آنکھیں موند لیں۔ چہرے پر مسکراہٹ طاری تھی اور ساتھ میں ایک کھلکھلاہٹ کی کیفیت جیسے کوئی اسے گدگدا رہا ہو جس سے اسے تکلیف بھی ہو رہی ہو۔ اور لطف بھی آ رہا ہو۔

گرمیوں کا دن ہو اور حبس سے اور لو لا دینے والی گرمی سے کہیں پناہ نہ مل رہی ہو تو پانی کی چھپ چھپ اور نہاتے ہوئے آدمی کی غڑ غڑ کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ سٹیوپک

کو دیکھ کر دا ئیموف اور کر دیا نے بھی جلدی جلدی کپڑے اتارے آنے والے لطف کے تصور میں قہقہے لگاتے ہوئے چلے اور باری باری غڑاپ سے ندی میں کود پڑے۔

خاموشی سے دھیرے دھیرے بہتی وہ چھوٹی سی ندی ان کی چھپ چھپ غڑ غڑ اور کلکاریوں سے گونجنے لگی۔ کر دیا کچھ اس انداز سے کھنکھار رہا تھا، ٹھٹھے مار رہا تھا اور چیخ و پکار کر رہا تھا جیسے وہ لوگ اسے دبوچ کر ڈبونے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ادھر دا ئیموف اس کا تعاقب کر رہا تھا اور اس کی ٹانگ پکڑنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

"ہاہاہا" وہ چلا رہا تھا

"پکڑ و اسے۔ دبوچ لو"

کر دیا بہت ٹھٹھے مار رہا تھا اور بہت لطف لے رہا تھا لیکن کیفیت اس کی وہی تھی جیسا خشکی میں دیکھا تری میں۔ اسی طرح احمق نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح حیران و پریشان دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی نے چپکے چپکے پیچھے سے اتر کر ایکا ایکی اس کے سر پر کلہاڑی کا دستہ مار دیا ہو۔

ایگو روشکا نے بھی کپڑے اتار پھینکے مگر وہ کنارے سے ندی میں نہیں اترا۔ کیا یہ کہ دوڑ لگائی اور کوئی دس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگائی۔ فضا میں کمان سی بناتا ہوا دھڑام سے پانی میں گرا، گہری ڈبکی لگائی مگر تہہ تک نہیں گیا کسی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار سی زور آور شے نے اسے سنبھال لیا اور دوبارہ سطح پر لا ڈالا۔ اس نے سر باہر نکالا، غڑ غڑ کی کر اس پاس بہت سے بلبلے بن گئے اور آنکھیں کھولیں۔ لیکن پانی میں اس کے چہرے کے بالکل پاس سورج کا عکس پڑ رہا تھا پہلے تو اس کی چکا چوند میں آنکھیں چندھیا گئیں پھر لیں لگا جیسے قوس قزح کے رنگ بکھرے ہوں۔ اس نے جلدی سے پھر ڈبکی لگائی۔ پانی میں آنکھیں کھولیں تو سبز دھندلکا سا دکھائی دیا جیسے چاندنی رات کا آسمان ہو پھر وہی لطافت درمیان میں آ گئی جس نے نہ اسے تلی سے لگنے دیا نہ ٹھنڈک کے بیچ ٹھہرنے دیا۔

پھر اسی طرح سطح کی طرف دھکیل دیا۔ اس نے سر باہر نکالا اور لمبا سانس لیا جس کے ساتھ ہی اسے اپنے سینے ہی میں بلکہ پیٹ میں بھی ایک کشادگی اور تازگی کا سا احساس ہوا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو کھلا چھوڑ دیا۔ کوشش کرنے لگا کہ پانی سے جتنا اور جیسا جیسا لطف اٹھا سکتے ہو اٹھاؤ۔ چت ہو کر تیرنے لگا۔ قدرے دھوپ سینکی، کچھ چھپاکے مارے چھینٹے اڑائے۔ پھر پیٹ ہو کر تیرنے لگا۔ پھر کروٹ سے تیرنا شروع کیا۔ پھر چت ہو کر اٹھنے لگا۔ غرض جیسی لہر آئی ویسا کرتا چلا گیا۔ آخر تھک گیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر نرسل کے جھنڈ کھڑے تھے۔ دھوپ میں وہ سنہری لگ رہے تھے اور ان کے پھول پھندنوں کی مثال پیارے سے انداز میں پانی کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ ایک مقام پر نرسل عجب عالم میں جھوم رہی تھی اور اس کے پھولوں میں ایک سرسراہٹ کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ اسی کے قریب سٹیونک اور کروہا جھینگا مچھلیوں کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔

" جھینگا مچھلی۔ ارے یارو دیکھو، جھینگا مچھلی" کروہا فاتحانہ انداز میں چلا اٹھا۔ اور واقعی اس کے ہاتھ میں ایک جھینگا مچھلی تڑپ رہی تھی۔

ایگورشکا تیرتا تیرتا نرسل کے جھنڈوں کی طرف جا نکلا۔ ایک ڈبکی لی۔ مگر وہ نرسل کی جڑوں میں الجھ گیا۔ پھسلواں دلدل میں دھنسنے لگا اور اس حالت میں اسے اپنے قریب کسی تیز اور لجلجی سی چیز کا احساس ہوا۔ غالباً یہ جھینگا مچھلی تھی۔ مگر اسی آن کسی نے اسے ٹانگ سے پکڑا اور اوپر کھینچا۔ اُخ تھو اُخ تھو کرتے ہوئے ایگورشکا نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ جیالا دا ٹیموف کھیں کھیں کر رہا ہے۔ یہ بدتمیز شخص کچھ ہانپ رہا تھا اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ ابھی وہ کچھ اور شرارت کرے گا۔ اس نے ایگورشکا کی ٹانگ مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور اس کی گردن پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا لیکن ایگورشکا نے ایک کراہت کے ساتھ اور کچھ دہشت زدہ ہو کر اس کا ہاتھ جھٹکا اور اپنے آپ کو اس سے چھڑا لیا جیسے اسے اس بات سے گھن آئی ہو کہ یہ شخص اسے ہاتھ لگائے گا اور یہ اندیشہ

ہو کہ یہ بدمعاش اسے ڈبو دے گا۔

"الو کے پٹھے، میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔" ایگور ٹسکا نے اسے کافی نہیں سمجھا جتنی اس کے یہاں اس شخص سے نفرت تھی اس کے حساب سے یہ بہت ناکافی تھا۔ رک کر بولا۔

"بدمعاش۔ کتیا کا بچہ۔"

لیکن دایئموف کی دانست میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس نے ایگورٹسکا کا مزید نوٹس نہیں لیا۔ تیر کر کرو ہا کی طرف چلا گیا اور چلانے لگا۔

"ہا ہا ہا ہا، یار آؤ مچھلیاں پکڑیں۔ مچھلیاں۔"

"ہاں ہاں بالکل،" کرو ہانے ہاں میں ہاں ملائی

"یہاں ضرور بہت سی مچھلیاں ہوں گی۔"

"ستیوپک، تو ذرا بھاگ کر گاؤں جا اور کسانوں سے ایک جال مانگ لا۔"

"وہ مجھے نہیں دیں گے۔"

"دیں گے کیسے نہیں۔ تو جا کے ان سے مانگ تو سہی عیسیٰ مسیح کا واسطہ دینا۔ آخر ہم بھی تو ایک طرح سے نائرہی ہیں۔"

"بالکل صحیح بات ہے۔"

ستیوپک مشکلوں سے پانی سے باہر آیا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنے اور ٹوپی سر پہ رکھے بغیر ہی بھاگ پڑا۔ اس کے پتلون کے بڑے پائنچے جھڑ جھڑ کر رہے تھے اور وہ گاؤں کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔

دایئموف سے جھڑپ کے بعد ایگورٹسکا کے لئے ندی میں کوئی کشش نہیں رہی پانی سے باہر آ کر اس نے کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ پانتلی اور واسیا پانی میں پاؤں لٹکائے ڈھلوان پہ بیٹھے تھے اور نہانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایمیلیان ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ پانی اس کے گھٹنوں تک آ رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے کھڑے سرکنڈوں کو پکڑ رکھا تھا

اور دوسرے ہاتھ سے بدن مل رہا تھا۔ ہڈی نکلے کاندھے، آنکھ تلے سوجھن، اس شکل وصورت کے ساتھ جھکا کھڑا تھا اور پانی سے ڈر رہا تھا۔ اس حالت میں عجب مضحکہ خیز مخلوق نظر آرہا تھا اس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔ پانی کو غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا گویا اس کی سرزنش کرنا چاہتا ہو کہ اسی کی وجہ سے دو نیز ندی میں اسے ٹھنڈ لگی اور وہ اپنی آواز کھو بیٹھا۔

"تم کیوں نہیں نہا رہے؟" ایگورشکا نے واسیا سے پوچھا۔

"مجھے نہانے کا کوئی ایسا شوق نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری ٹھوڑی کیوں سوجھی ہوئی ہے؟"

"بری لگتی ہے...... ننھے میاں بات یہ ہے کہ میں دیا سلائی کے ایک کارخانے میں کام کیا کرتا تھا۔ وہاں ڈاکٹر مجھ سے کہا کرتا تھا کہ اس سے تمہارا جبڑا گل جائے گا۔ وہاں کی ہوا صحت کے لئے اچھی نہیں ہے۔ میرے سوا وہاں تین اور جوان تھے جن کے جبڑے سوجھے ہوئے تھے۔ ایک کا جبڑا تو بالکل گل چکا تھا۔"

ستیپو یا جال لے کر لپک جھپک آیا۔ دائیموف، اور کروہا بہت دیر سے پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ اس کے اثر سے ان کے بدن نیلے پڑ گئے تھے اور آواز بیٹھ گئی تھی۔ لیکن اسی کے باوجود وہ بڑے ذوق وشوق سے مچھلیاں پکڑنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ پہلے وہ نرسل کے جھنڈوں کے قریب جہاں پانی گہرا تھا پہنچے۔ وہاں پانی دائیموف کی گردن تک آرہا تھا اور پستہ قد کروہا کے سر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ کروہا کے منہ میں حلق میں پانی بھر گیا اور اسی کے منہ کے پاس بلبلے بننے لگے۔ دائیموف کانٹے دار جھاڑیوں سے بچنے کی کوشش میں جال میں جا الجھا۔ دونوں پانی میں ہاتھ پیر مارتے لگے مچھلیوں کے شکار کی کوشش میں وہ خراب ہی ہوئے، حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا۔

"پانی بہت گہرا ہے،" کروہا بولا۔

"یہاں کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"ابے بھتنی والے' اینچے مت۔" دائیموف نے جال کو صحیح پوزیشن میں لائے ہوئے چلا کر کہا "اسے تھامے رکھ۔"

"یہاں تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔" کنارے سے پانتلی پکارا

"احمقو، تم بس مچھلیوں کو ڈرا رہے ہو۔ باقی کچھ حاصل نہیں ہوگا اور بائیں کی طرف جاؤ۔ وہاں پانی اتھلا ہے۔"

ایک بار ایک بڑی سی مچھلی ٹھیک جال کے اوپر چھلانگ لگاتی دکھائی دی۔ دونوں کی یہ حالت کہ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے۔ جس جگہ وہ مچھلی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ اس جگہ دائیموف نے زور سے مکا مارا۔ اس کے چہرے پہ برہمی کی کیفیت نمایاں تھی۔

"ارے رے" پانتلی چلایا۔ پیر پٹختے ہوئے بولا۔

"ابے تم نے موقعہ گنوا دیا۔ وہ گئی۔"

دائیموف اور کیرو ہا تھوڑا اور بائیں کی طرف چلے۔ یہاں انہوں نے ایک اتھلی جگہ کو چنا اور پورے انہماک کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے میں لگ گئے۔ گاڑیوں سے وہ کوئی سو قدم دور نکل گئے تھے۔ چپکے چپکے پانی میں نیچے اترتے اور نرسل کے قریب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ذرا ذرا کر کے قدم بڑھا رہے تھے۔ ساتھ میں جال کو کھینچتے جاتے تھے مٹھیوں سے پانی کو ہٹلاتے جاتے تھے کہ وہ جال کے قریب پہنچ جائیں۔ آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ ایک تو دھوپ میں جھلسے جا رہے تھے۔ اوپر سے مکھیاں کاٹ رہی تھیں۔ ان کے بدن جو نیلے پڑ گئے تھے اب سرخ ہو رہے تھے۔ ستیوپک ڈول لئے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے اپنی قمیص بغل تک اٹھا کر کنارے دانتوں میں دبا لئے تھے۔ ہر مرتبہ جب پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو مچھلی اٹھا کر ۔ میں لہراتا کہ دھوپ میں وہ جھلملاتی نظر آتی پھر نعرہ لگاتا۔

"یہ دیکھو ہماری مچھلی۔ ایسی پانچ ہیں ہمارے پاس"

ہر دفعہ جب دائیموف، کمروہا اور سٹیو پک جال کو کھینچتے تو اس میں پھنسی ہوئی کیچڑ مٹی میں ہاتھ گھنگھولتے۔ اس میں سے الگ کر کے کچھ چیز ڈول میں ڈال لیتے۔ باقی کو پھینک دیتے کبھی کبھی یہ کرتے کہ جال سے کوئی چیز نکال کر دوسرے کو پکڑا دیتے۔ دوسرا اسے دیکھ کر تیسرے کو پکڑا دیتا بڑے تجسّس سے اُلٹ پلٹ کر اسے دیکھتے پھر اسے پھینک دیتے۔

"کیا چیز ہے؟" انہوں نے کنارے سے چلا کر پوچھا۔

سٹیو پک نے جواب میں کچھ کہا تو سہی۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہا۔ پھر وہ پانی سے نکل آیا۔ دونوں ہاتھوں میں ڈول تھامے اور قمیص اسی طرح اوپر اُٹھائے کنارے دانتوں میں دابے وہ گاڑیوں کی طرف دوڑ پڑا۔

"یہ بھر گیا" سانس اس کا چڑھا ہوا تھا اور وہ چلا رہا تھا۔

"مجھے دوسرا برتن دو"

ایگورنسکا نے ڈول پر نظر ڈالی۔ وہ مچھلیوں سے لبالب بھرا تھا ایک نوخیز مچھلی نے اپنی بدصورت ناک پانی سے باہر نکالی۔ اس کے اردگرد جھینگا مچھلیاں اور دوسری چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہجوم کئے ہوئے تھیں۔ ایگورنسکا نے ڈول کی تہہ میں ہاتھ ڈال کر پانی کو گھنگھول ڈالا۔ مچھلی جس نے ناک باہر نکالی تھی جھینگا مچھلیوں کے بیچ کہیں غائب ہو گئی اس کی بجائے کئی دوسری قسم کی مچھلیاں تیر کر اوپر آ گئیں۔ واسیا نے بھی ڈول پر ایک نظر ڈالی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور چہرے پر شفقت کی کیفیت جھلکنے لگی۔ اسی طرح جس طرح اب سے پہلے لومڑی کو دیکھ کر کیفیت طاری ہوئی تھی اس نے ڈول سے کوئی چیز نکال کر منہ میں رکھ لی اور چبانے لگا۔

"ارے یارو" سٹیو پا سخت حیرانی کے عالم میں کہنے لگا "واسیا گجین مچھلی زندہ کھا رہا ہے ہا چھی چھی چھی"

"یہ گجین مچھلی نہیں، منّو[1] مچھلی ہے۔" واسیا نے بہت سکون سے جواب دیا۔ دانت اس کے ابھی تک چل رہے تھے۔

چباتے چباتے اس نے منہ سے مچھلی کی دم نکالی۔ اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پھر منہ میں رکھ لیا جب یہ شخص مچھلی کو دانتوں سے کرڑ کرڑ چبا رہا تھا تو ایگور نشکا کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی غیر انسانی حرکت ہوتے دیکھ رہا ہے۔ واسیا کی سوجھی ہوئی تھوڑی چمک سے محروم اس کی آنکھیں۔ اس کی غیر معمولی تیز نظر، اس کے منہ میں دبی ہوئی مچھلی کی دُم اور جس رغبت جس شوق سے وہ مچھلی کو کرڑ کرڑ چبا رہا تھا، یہ سب مل کر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ شخص کوئی جیوان ہے۔

اس شخص کو اس عالم میں دیکھ کر ایگور نشکا کے اندر ہول اُٹھنے لگی۔ مچھلی کا شکار اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ گاڑیوں کے برابر برابر چلنے لگا۔ پھر کچھ سوچا اور بیزاری کے عالم میں ٹہلتا ٹہلتا گاؤں کی طرف نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ وہ گرجا گھر میں کھڑا تھا اور کسی بھلے آدمی کی پشت پر اپنی پیشانی ٹکائے حمدیہ گیت سن رہا تھا۔ سروس اب اپنے ختم پر تھی۔ ایگور نشکا کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ کیا الا پا جا رہا ہے اس نے سمجھنے کے لئے کوئی ایسا تردّد بھی نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کان لگا کر سنا۔ پھر جماہی لی اور اپنے آگے کھڑے لوگوں کے سروں اور پشتوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک سر سرخ ہو رہا تھا اور بھیگا بھیگا تھا جو چغلی کھا رہا تھا کہ ابھی غسل کیا ہے اس سر سے اس نے پہچانا کہ یہ شخص ایمیلیان ہے اس کی گدی پر استرا معمول سے ذرا اونچا پھیر اگیا تھا۔ آگے سے بھی بال بڑے بے ڈھب طریقے سے تراشے گئے تھے اور ایمیلیان کے کان ڈھاک کے پتوں کی طرح کھڑے دکھائی دے

---

[1] گجین GUDGEON اور منو MINNOW چھوٹی مچھلیوں کی دو قسمیں

رہے مجھے لگتا تھا کہ ان کانوں کو خود بھی اپنے بے تکے پن کا احساس ہے اس کی گُدّی اور اس کے کانوں کو دیکھ کر ایگورشکا نے جانے کیوں یہ قیاس کیا کہ ایمبلیان شاید نامردی کا شکار ہے اسے خیال آیا کہ جب یہ شخص نہا رہا تھا تو کس طرح ہاتھ چلا رہا تھا۔ اس کی آواز کس طرح پھنسی پھنسی نکل رہی تھی اور اس کے انداز میں کتنی جھجک تھی۔ یہ سوچتے ہوئے اسے ایمبلیان پر بہت ترس آیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے محبت مروت کی ڈیڑھ بات کر لینی چاہیئے۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"میں بھی یہاں ہوں"

جو لوگ حمد گانے والی منڈلی کے ساتھ مل کر گاتے ہیں خواہ اونچے سر میں خواہ نیچے سر میں اور خاص طور پر وہ لوگ جنہوں نے کبھی کسی حمدیہ منڈلی کی قیادت کی ہے۔ وہ بالعموم لڑکوں بالوں سے بڑی درشتی سے پیش آتے ہیں حمدیہ منڈلی سے ان کا ناتا ٹوٹ جائے تب بھی وہ اپنی اس عادت سے باز نہیں آتے۔ ایمبلیان نے ایگورشکا کو خشمگیں نظروں سے دیکھا اور کہا:

"گرجا گھر میں کھیل کود کی جگہ نہیں ہے"

ایگورشکا وہاں سے سرک کر آگے چلا گیا۔ اب وہ اس جگہ کے قریب تھا جہاں شبیہ نصب تھی یہاں اسے دلچسپ لوگ نظر آئے۔ دائیں سمت میں سب سے آگے ایک خاتون اور ایک معزز شخص کو قالین پہ کھڑے دیکھا۔ ان کے پیچھے کرسیوں کی قطار تھی معزز شخص نے بنا استری کیا ہوا پتلون پہن رکھا تھا۔ یہ شخص ایسے ساکت و جامد کھڑا تھا جیسے ایک سپاہی سیلیوٹ کرتے ہوئے کھڑا ہوتا ہے اپنی شیو کی ہوئی نیلاہٹ مائل ٹھوڑی کو اس نے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ اس کا کھڑا کالر، اس کی نیلاہٹ مائل ٹھوڑی، اس کے سر کا ننھا سا گنج، اس کی چھڑی، ان سب نے مل کر اس کے طور میں ایک وقار کی شان پیدا کر دی تھی۔ حد سے گزرے رکھ رکھاؤ کے باعث اس کی گردن اتنی تن گئی تھی۔

اور ٹھوڑی اتنی کھنچ گئی تھی اور ٹھوڑی اتنی کھنچ گئی تھی کہ لگتا تھا کہ بس ابھی اس کا سر کھٹ اک سے ٹوٹ کر گردن سے الگ ہوگا اور اوپر اڑتا نظر آئے گا اور اس دہرے بدن والی بزرگ خاتون کا جس نے سفید شال اوڑھ رکھی تھی عالم یہ تھا کہ سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ کچھ ایسا انداز تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ نہیں۔ آپ شکریہ کی زحمت نہ کریں۔ مجھے شکریہ وکریہ بالکل پسند نہیں ہے۔ ...... قالین کے چاروں طرف سروں کی ایک فصیل کھنچی نظر آرہی تھی۔ کوچک روس کے باسیوں کے سروں کی فصیل۔

ایگورشکا شبیہوں کے طاق کے قریب گیا اور شبیہوں کو بوسہ دینے لگا۔ ہر شبیہ کے سامنے جاکر بڑی آہستگی کے ساتھ زمین پہ سجدہ ریز ہوا۔ سجدے میں پڑے پڑے اردگرد پھیلے ہوئے عقیدت مندوں کے مجمعے پر نظر دوڑائی اور پھر سجدے سے اٹھ کر شبیہ کو بوسہ دیا۔ جب اس کی پیشانی ٹھنڈے ٹھنڈے فرش سے مس ہوئی تو اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ اور جب گرجا گھر کے ناظم صاحب شمعوں کو بجھانے کے خیال سے ایک لمبا سا گل گیر لے کر مقدس چبوترے سے اتر کر آئے تو ایگورشکا فرش سے اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔

"کیا توشہ بٹ چکا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"یہاں کوئی توشہ نہیں بٹ رہا۔" ناظم صاحب درشت لہجہ میں بڑبڑائے۔

سروس ختم ہو چکی تھی۔ ایگورشکا گرجا گھر سے خراماں خراماں نکلا اور بازار میں گشت کرنے لگا۔ اس نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں کتنے ہی دیہات اور بازار ہاٹ دیکھ رکھے تھے اس لئے جو چیزیں یہاں نظر آرہی تھیں۔ ان میں اس کے لئے کوئی کشش نہیں تھی ـــــ جب اس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو وہ ایک دکان میں داخل ہو گیا جس کے دروازے پر سرخ سوتی کپڑے کی ایک چوڑی سی پٹی لٹکی ہوئی تھی۔ اس دکان کے دو حصے تھے۔ ویسے تو یہ دونوں حصے کشادہ تھے مگر ان میں روشنی واجبی واجبی تھی۔ آدھے حصے میں سوتی مال

اور کریانے کی دکان تھی باقی آدھے حصے میں تارکول کے ٹب رکھے تھے اور چھت میں گھوڑے کی لگامیں لٹک رہی تھیں۔ دکان کے دونوں ہی حصوں سے چمڑے اور تارکول کی بساند اُٹھ رہی تھی۔ دکان کے فرش پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا مگر جس نے یہ چھڑکاؤ کیا تھا وہ ضرور کوئی سنکی اور نرالی مخلوق ہو گا کہ پانی اس انداز سے چھڑکاؤ کیا تھا کہ اس سے طرح طرح کے نقش ونگار اور عجیب عجیب سی شکلیں بن گئی تھیں۔ دکاندار بہت کھایا پیا دکھائی دیتا تھا اس طرح کھڑا تھا کہ اپنا سارا بوجھ کاؤنٹر پہ ڈال رکھا تھا۔ ایک شکر کی ڈلی چوستا جاتا تھا اور چائے پیتا جاتا تھا۔ ہر چسکی کے ساتھ لمبا سانس لیتا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک مکمل بے تعلقی کی کیفیت ٹپک رہی تھی۔ لیکن جب وہ چسکی کے ساتھ لمبا سانس لیتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ذرا دم لو۔ تمہیں دوں گا۔

"ایک پیسے کے سورج مکھی کے بیج دے دو" ایگورشکا نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دکاندار نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے ہٹ کر باہر کی طرف آیا، سورج مکھی کے بیج ایک خالی تیل پھلیل کی ڈبیا میں بھر کر جسے وہ بطور پیمانہ استعمال کرتا تھا ایگورشکا کی جیب میں ڈال دیئے۔ لیجئے پیسے کے بیج ہو گئے۔ مگر ایگورشکا یہاں سے ٹلنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کیک کے ایک ڈبے کا دیر تک جائزہ لیتا رہا۔ تھوڑا سوچا پھر چند چھوٹے چھوٹے کیکوں کی طرف اشارہ کر کے جن پہ زیادہ دن گزر جانے کی وجہ سے پھپھوندی جم گئی تھی پوچھا۔

"یہ کیک کتنے کتنے کے ہیں؟"

"پیسے کے دو"

ایگورشکا نے جیب سے وہ کیک نکالا جو کل اسے یہودن نے دیا تھا اور پوچھا۔

"اور اس طرح کے کیک تم کے کے پیسے کے دیتے ہو؟"

دکاندار نے وہ کیک سے کر الٹ پلٹ کر دیکھا، ایک آنکھ اٹھائی۔ بولا "یہ کیک"
پھر دوسری آنکھ اٹھا کر دیکھا اور جواب دیا۔

"تین پیسے کے دو۔"

خاموشی چھا گئی۔

"میاں تم کس کے بیٹے ہو" دکاندار نے سرخ دھات کی چائے دانی سے اپنے
لئے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے سوال کیا۔

"بس ایوان ایوینچ کا بھانجا ہوں۔"

"ایوان ایوینچ آخر کتنے ہیں اور کس کس قماش کے ہیں" دکاندار نے ایک چسکی بھرتے ہوئے
سانس کھینچا۔ ایگور نشکا کے سر سے اوپر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے دروازے کو دیکھا، گھڑی بھر
توقف کیا۔ پھر پوچھا "چائے پیو گے؟"

"جی........" ایگور نشکا نے رکتے رکتے جواب دیا۔ حالانکہ صبح کی چائے کے لئے
جو اس کے معمول میں شامل تھی وہ تلملا رہا تھا۔

دکاندار نے ایک گلاس میں چائے انڈیل کر اسے دی اور ساتھ میں ایک شکر کی
ٹکیا دی جو تھوڑی چوسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایگور نشکا فولڈنگ چیر پہ بیٹھ کر چائے
پینے لگا۔ وہ چینی میں تلے باداموں کا بھاؤ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی وہ اس
مضمون کی طرف آیا ہی تھا کہ ایک گاہک آن دھمکا اور دکاندار نے اپنا چائے کا گلاس
چھوڑ کر ادھر حاضری دینی شروع کر دی۔ وہ گاہک کو لے کر دکان کے دوسرے حصے
میں چلا گیا جہاں تار کول کی بو بسی ہوئی تھی۔ وہاں وہ بہت دیر تک اس سے جھک جھک
کرتا رہا۔

گاہک بھی کوئی بہت اڑیل اور خرد ماغ معلوم ہوتا تھا نفی میں سر ہلائے جا رہا
تھا جیسے اسے کوئی چیز پسند ہی نہیں آ رہی تھی اور دکان سے باہر کی طرف کھسکتا چلا

جا رہا تھا۔

دکاندار نے اسے راہ پہ لانے کی کوشش کرتے کرتے ایک بڑے سے بورے میں جئی ڈالنی شروع کر دی۔

"اسے جئی کون کہے گا" گاہک نے ازردہ سے لہجہ میں کہا۔

"یہ جئی تھوڑا ہی ہے۔ بھوسی ہے بھوسی۔ مرغیوں کو یہ کھلانا ان کے ساتھ مذاق ہوگا۔ وہ کھائیں گی تو کیا اسے دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جائیں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں میں پونداریکو جا کر خریداری کروں گا"

جب ایگور شکا واپس ندی کنارے پہنچا تو وہاں ایک چھوٹا سا سفری چولہا روشن تھا۔ گاڑی بان اپنارات کا کھانا پکا رہے تھے۔ سینیوپک دھوئیں میں کھڑا ایک بڑے سے کف گیر سے ہنڈیا گھوٹ رہا تھا۔ ایک طرف بیٹھے کرو ہا اور واسیا مچھلیوں کو صاف کر کے بنا رہے تھے۔ دھوئیں سے ان کی آنکھیں لال لال ہو رہی تھیں۔ ان کے سامنے جال پڑا تھا جس پر کیچڑ مٹی اور دریائی گھاس لپٹی ہوئی تھی۔ اس جال پر کچھ بڑی مچھلیاں چمک رہی تھیں اور کچھ جھینگا مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔

ایمیلیان جسے گرجا گھر سے آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی پانتلی کے برابر بیٹھا تھا۔ اپنے بازوؤں کو جنبش دے رہا تھا اور اپنی بھاری آواز میں کسی قدر بلند لہجہ میں گنگنا رہا تھا

ع ثنا تیری ہی اے خالق کیا کرتے ہیں ہم

دائموف گھوڑوں کے آس پاس گھوم رہا تھا

کروہا اور واسیا جب مچھلیوں کو صاف کر چکے تو انھوں نے مچھلیوں اور زندہ جھینگا مچھلیوں کو اکٹھا ڈول میں ڈال دیا۔ ان میں مسالہ لگایا اور ابلتے پانی میں جھونک دیا۔

سینیوپک نے ابلتے شوربے سے پھین اتارتے ہوئے پوچھا "تھوڑی چکنائی ڈال دوں ؟"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مچھلیوں کی اپنی چربی جو ہو گی۔" کروبلے نے جواب دیا۔

چولہے سے اتارنے سے پہلے ستیوپک نے ہنڈیا میں تین مٹھی کلونجی اور چمچہ بھر نمک ڈال کر اسے کف گیر سے ہلا دیا۔ یہ کر چکنے کے بعد اس نے سالن کو تھوڑا چکھا، ہونٹوں پہ زبان پھیری، چمچے کو چاٹا اور پھر اطمینان بھری آواز نکالی جس کا مطلب تھا کہ ہنڈیا پک کر تیار ہو گئی ہے۔

پانتلی کو چھوڑ کر باقی سب ہنڈیا کے گرد بیٹھ گئے اور اپنے اپنے چمچہ سے کھانے لگے۔

"تم بھی یہاں موجود ہو۔ ارے بھئی اس بچہ کو بھی ایک چمچہ دے دو۔" پانتلی نے تیز لہجہ میں کہا:

"میرا خیال ہے کہ اسے بھوک لگی ہوئی ہے۔"

"ہمارا تو کسا نوں والا کھاجا ہے۔" کروبلے بولا۔

"جب بھوک لگی ہو تو کسانوں والا کھاجا بھی اچھا لگتا ہے۔"

انہوں نے ایگورشکا کو بھی ایک چمچہ تھما دیا۔ اس نے بھی کھانا شروع کر دیا مگر بیٹھ کر نہیں بلکہ ہنڈیا کے برابر کھڑے ہو کر۔ ہنڈیا میں وہ اس طرح جھانک رہا تھا جیسے کسی سوراخ میں جھانکتے ہیں۔

سالن میں سے مچھلی کی مہک آ رہی تھی اور مچھلی کے چھلکے کلونجی کے ساتھ رل مل گئے تھے۔ جھینگا مچھلی چمچہ سے نہیں نکالی جا سکی۔ یاروں نے اسے ہاتھ ڈال ڈال کر نکالا اور دوا سیانے تو اس بے تکلفی سے ہاتھ ڈال کر اسے نکالا کہ اس کی آستین سالن میں سن گئی اور سارا ہاتھ شرابور ہو گیا۔ اس کے باوجود ایگورشکا کو سالن بہت مزے دار لگا۔ اسے جھینگا مچھلی کا وہ سوپ یاد آ گیا جو اس کی اماں روزوں کے دنوں میں تیار کیا کرتی تھیں۔ پانتلی الگ بیٹھا روٹی چبا رہا تھا۔

"دادا، تم کیوں نہیں کھا رہے؟" ایمیلیان نے اس سے پوچھا۔

"میں جھینگا مچھلی نہیں کھاتا...... مجھے گھن آتی ہے۔" یہ کہتے کہتے اسے ایسی گھن آئی کہ اس نے اس طرف سے منہ پھیر لیا۔

یار لوگ کھا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ان باتوں سے ایگورنشکا نے یہ اندازہ لگایا کہ اس کے یہ نئے واقف کار ہر چند کہ عمروں اور عادات واطوار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر ان میں ایک بات مشترک ہے جس کی وجہ سے وہ سب ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ یہ بات کہ ان کا ماضی شاندار ہے مگر حال ابتر ہے اپنے گزرے دنوں کے بارے میں وہ سب ان میں سے ایک ایک بڑی گرمجوشی سے باتیں بکھان رہا تھا۔ مگر اپنے حال کے بارے میں ان کا رویہ کچھ بیزاری کا سا تھا۔ روسی بندے کو زندگی کی یادیں بہت لطف آتا ہے مگر زندگی بسر کرنے کا اسے ایسا شوق نہیں ہوتا۔ ایگورنشکا غریب کو ابھی اس حقیقت کا کہاں علم تھا۔ ہنڈیا جب تک بالکل نہیں پونچھ گئی وہ یہی سمجھتا رہا کہ اس ہنڈیا کے گرد جو یار بیٹھے ہیں وہ قسمت کے مارے ستم رسیدہ لوگ ہیں۔ پانتلی انہیں سنانے لگا کہ پرانے دنوں میں جب ابھی ریل نہیں چلی تھی وہ گاڑیوں کے ساتھ ماسکو اور نزنی تک جایا کرتا تھا اور اتنا کما لیتا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس پیسہ کو کہاں خرچ کیا جائے اور ان دنوں بیوپاری کیا لوگ ہوا کرتے تھے اور مچھلیاں واہ واہ سبحان اللہ اور کیا سستے کا زمانہ تھا۔ اب سڑکیں چھوٹی ہو گئی ہیں۔ بیوپاری بخیل ہو گئے ہیں۔ کسانوں کی غربت بڑھ گئی ہے۔ روٹی مہنگی ہو گئی ہے۔ ہر چیز سکڑ گئی ہے۔ چھوٹی ہو گئی ہے۔ ایمیلیان بتانے لگا کہ گزرے دنوں میں وہ لگانسکی کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ حمد یہ منڈلی میں شامل تھا۔ کیا کمال کی اس کی آواز تھی۔ کس شان سے وہ نغمہ سرائی کرتا تھا۔ اب اس کی یہ اوقات ہے کہ ایک کسان ہے اور بھائی کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہے۔ اور بھائی کا حال یہ ہے کہ اپنے گھوڑے دے کر اسے بھیجتا ہے اور جو کچھ وہ کما کر لاتا ہے اس میں سے آدھا خود سنگھوا لیتا ہے۔ واسیا بھلے زمانے میں دیا سلائی کے

کارخانے میں کام کیا کرتا تھا۔ کرو ہا ایک امیر گھر میں کوچوان کی حیثیت سے ملازم تھا۔
تین گھوڑوں والی گاڑی کے کوچوان کے طور پر وہ پورے ضلع میں اول نمبر کا مانا جاتا تھا
دائیموف ایک کھاتے پیتے زمیندار کا نونہال تھا۔ عیش سے گزرتی تھی۔ راوی چین لکھتا
تھا۔ نے غم دنیا نے غم کا لاسا بھی مشکل سے بیس برس کا ہوا ہو گا کہ اس کے سخت گیر ظالم
باپ کے دماغ میں یہ سمائی کہ لڑکا گھر پہ رہے گا تو بگڑ جائے گا۔ اسے کسی کام میں ڈال دینا
چاہیئے۔ سو اس نے اسے قلیوں کے ساتھ کام کرنے کے لئے گھر سے بھیج دیا کہ وہاں کچھ کھا
کمائے گا۔ ہر ایک اپنی اپنی بپتا سنا رہا تھا۔ بس ایک ستیوپک چپ بیٹھا تھا۔
مگر اس کے ڈاڑھی سے بے نیاز چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ ان سب سے
بڑھ کر اس شخص نے اچھے دن دیکھے ہیں۔

باپ کا خیال آنے کے ساتھ دائیموف کی تیوری چڑھ گئی۔ اس نے کھانے سے
ہاتھ کھینچ لیا۔ برہم نظروں سے ساتھیوں کو دیکھا۔ پھر یہ نظریں ایگورشکا پہ جا ٹکیں۔

"ابے او لے دین، ٹوپی اُتار"، درشت لہجہ میں بولا۔

"کوئی ٹوپی پہن کے کھاتا ہے۔ بچے بھی نہیں کھاتے"

ایگورشکا نے سر سے ہیٹ اتار لیا۔ بولا کچھ نہیں مگر اب سالن کا سارا مزہ جاتا
رہا۔ اور اس نے یہ بھی نہیں سنا کہ پانتی اور واسیا جو اس کی طرفداری میں دائیموف
سے جھگڑے ہوئے ہیں کیا کہہ رہے ہیں۔ توہین کرنے والے آدمی کے خلاف وہ اندر ہی
اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور اس نے دل پہ دھر لیا کہ وہ اس سے بدلہ لے گا۔
چاہے اس کے بعد کچھ بھی ہو۔

کھانے کے بعد سب اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے اپنی گاڑیوں کی طرف چلے گئے
اور ان کے سائے تلے پڑ رہے۔

"دادا، ہم اب جلدی چل رہے ہیں نا؟" ایگورشکا نے پانتلی سے پوچھا۔

"یہ تو خداوند کی مرضی پہ ہے۔ جب وہ چاہے گا چلیں گے، مگر ابھی نہیں چلیں گے
ابھی تو بہت گرمی ہے۔ اے خداوند، ہم راضی برضا ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ اے
مقدس ماں۔۔۔۔۔۔۔ ننھے میاں، لیٹ جاؤ۔"

ادھر گاڑیوں تلے سے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ ایگورشکا نے ہمت باندھی کہ گاؤں کی طرف چلا جائے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا، جماہی لی اور بوڑھے شخص کے برابر جا لیٹا۔

---

(۶)

گاڑیاں سارے دن ندی کنارے کھڑی رہیں جب سورج غروب ہونے پہ آیا تب کہیں انہوں نے چلنا شروع کیا۔

ایگورشکا پھر گانٹھوں پہ لیٹ گیا۔ گاڑی دھیرے دھیرے چوں چوں کرتی دائیں بائیں ڈولتی چل رہی تھی۔ پانتلی پیر پٹختا، رانوں کو تھپتھپاتا۔ کچھ بڑ بڑاتا گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کل کی طرح آج بھی فضا ٹیپی کی موسیقی سے لبریز تھی۔

ایگورشکا اپنے دونوں ہاتھ گدی کے نیچے رکھے چت لیٹا تھا اور آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ شام کی شفق سے سارا آسمان لال ہو رہا ہے جیسے آگ لگی ہو۔ پھر اس نے روشنی کو جلتے ہوئے دیکھا۔ نگہبان فرشتوں نے دور افق میں اپنے سنہری شہپر سمیٹے اور رات کو آرام کرنے کے لئے رخصت ہو گئے، دن کامیاب گزرا۔ اب نرم آنند بھری رات ڈیرا کرنے کو ہے۔ شاید یہ فرشتے آسمانوں میں اپنے ڈیرے میں جا کر ستائیں گے .....

ایگورشکا نے دیکھا کہ آسمان پہ اندھیرا چھانے لگا ہے، زمین پہ دھندلکا پھیلتا جا رہا ہے اور ستارے آسمان پہ ایک ایک کر کے نمودار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اگر آپ دیر تک وسیع و عریض آسمان کو تکتے رہیں تو آپ کے خیالات میں اور آپ کی روح میں ایک احساس تنہائی کروٹ لینے لگے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ آپ اکیلے ہیں اور یہ اکیلا پن اٹل ہے۔ آگے جو چیزیں آپ کو اپنے سے بہت قریب اور متعلق نظر آتی

تھیں وہ سب چیزیں اب یوں معلوم ہوں گی کہ آپ سے بے حد دور ہیں اور یہ ہیں ستارے کہ ہزاروں برس سے زمین کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں، دھندلکے، حد ادراک سے پرے پھیلا ہوا آسمان کہ آدمی کی روز مرہ زندگی سے بے نیاز ہے جب آدمی ان کے روبرو ہوتا ہے اور ان کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ سب مل کر اپنی اتھاہ خاموشی سے روح کو مسوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ آدمی کو اس تنہائی کا خیال آنے لگتا ہے جو قبر میں ہماری آپ کی سب کی منتظر ہے اور زندگی کی حقیقت بہت بھیانک بہت مایوس کن معلوم ہونے لگتی ہے۔

ایگورنشکا کو اپنی دادی اماں کا خیال آ گیا جو اب قبرستان میں شاہ بلوط کے سائے تلے منوں مٹی کے نیچے سوئی پڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وہ تصویر پھر گئی کہ کس طرح وہ تابوت میں لیٹی ہوئی تھیں اور ان کی آنکھوں پر پیسے رکھے ہوئے تھے اور پھر کس طرح تابوت میں انہیں بند کر کے قبر میں اتار دیا گیا۔ اسے یہ تک یاد آ گیا کہ جب مٹی کے ڈھیلے قبر میں ڈالے گئے تھے تو وہ تابوت کے ڈھکن سے ٹکرا ٹکرا کر کیسی کھوکھلی آواز پیدا کر رہے تھے اس نے اپنی دادی اماں کا کچھ اس طرح تصور باندھا کہ بے چاری تنگ اندھیرے تابوت میں بے یار و مددگار کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہیں۔ پھر اس کے تصور نے ایک اور نقشہ باندھا کہ جیسے اس کی دادی اماں اچانک چونک کر اٹھ بیٹھی ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کہاں ہیں، تابوت کے ڈھکن کو کھٹکھٹاتی ہیں اور مدد کے لئے چیختی پکارتی ہیں۔ آخر دہشت کھا کر بے ہوش ہو جاتی ہیں اور پھر مر جاتی ہیں۔

اس نے اپنے مرنے کا بھی تصور باندھنا چاہا۔ جیسے اس کی ماں، پادری کرسٹفر، کاؤنٹس ڈرانز کی، سلیمان......... اس نے کتنی کوشش کی یہ تصور باندھنے کی کہ گھر سے دور سب سے الگ تھلگ بے کسی کے عالم میں اندھیری قبر میں مرا پڑا ہے لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا۔ خود اپنی موت کا وہ قیاس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو کچھ ایسا محسوس

کرتا تھا کہ جیسے وہ مرے گا ہی نہیں۔

پاسٹی کر قریب میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ نیچے گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ اپنی ہی ادھیڑ بن میں تھا

"اچھا ٹھیک ہے...... اچھے پیارے لوگو" وہ بڑبڑا رہا تھا:

"اپنے ننھے بیٹے کو سکول میں داخل کرا دیا۔ مگر سکول میں وہ کیسا چل رہا ہے، اس کا مجھے پتہ نہیں۔ کچھ سننے میں نہیں آیا...... سلادیا نوسر بسک میں ...... میں کہتا ہوں کہ وہاں لڑکوں کے لئے کوئی اچھا سکول نہیں ہے ...... نہیں۔ یہ ٹھیک بات ہے...... ننھا منا پیارا سا بچہ ہے بڑا ہو کر باپ کا سہارا بنے گا...... اینگوری آج تم بچے ہو۔ مگر کل بڑے ہو گے اور اپنے ماں باپ کی دیکھ بھال کرو گے خداوند کا حکم ہے کہ اپنے ماں باپ کی اور ماں کی عزت کرو...... میرے بھی بچے تھے مگر وہ جل کر مر گئے...... میری بیوی جل کر مری۔ میرے بچے جل کر مرے...... صحیح کہہ رہا ہوں۔ وہ ایپی فینی کی رات تھی، میرے جھونپڑے میں آگ لگ گئی...... میں اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ میں اوریابول میں گاڑی ہانک رہا تھا اور ایبول میں ...... ماریا تو بھاگ کر گلی میں نکل گئی تھی۔ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ بچے تو اندر سو رہے ہیں۔ وہ پھر بھاگ کر اندر گئی اور جل کر بھسم ہو گئی...... اگلے دن وہاں سوائے ہڈیوں کے اور کچھ نہیں بچا تھا۔"

کوئی آدھی رات کا وقت ہو گا، اینگورنکا اور گاڑی بان پھر سفری چولہے کے گرد گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ ادھر خشک ٹہنیاں اور ڈنڈیاں جل رہی تھیں۔ ادھر کروزا اور واسیا کسی کھاڑی سے پانی لینے کے لئے کہیں نکل گئے۔ وہ اندھیرے میں دکھائی تو نہیں دے رہے تھے لیکن ان کی باتوں کی اور ان کے ڈولوں کے کھڑکنے کی آوازیں مستقل سنائی دے رہی

تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھاڑی ایسی دور نہیں تھی۔ آگ کی روشنی سے زمین پہ ایک بڑا سا
تھرتھراتا ہالہ بن گیا تھا۔ اگرچہ چاند خوب چمک رہا تھا۔ اس کے باوجود اس سرخ ہالے سے
پرے جو بھی چیز تھی وہ انتہا کالی سیاہ دکھائی پڑتی تھی اس روشنی سے گاڑی بانوں کی
آنکھیں تھوڑی تھوڑی چندھیائی ہوئی تھیں۔ سوا نہیں اس بڑی سڑک کا بس تھوڑا سا حصہ
نظر آرہا تھا۔ گانٹھوں سے لدی گاڑیاں اور گھوڑے اندھیرے میں مشکل ہی سے دکھائی پڑ
رہے تھے۔ بس ایک پہاڑ سا نظر آرہا تھا جس کے خطوط واضح نہیں تھے۔ چولہے سے کوئی
بیس قدم پرے سڑک کے کنارے قبر پہ نصب ہونے والی ایک کاٹ کی صلیب نظر
آرہی تھی کہ ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی اس وقت جب ابھی آگ روشن نہیں ہوئی تھی
اور تھوڑی دور تک نظر ڈالی جاسکتی تھی ایگورشکا نے اسی طرح کی ایک صلیب اور
اسی طرح ایک طرف کو جھکی ہوئی بڑی شاہراہ کے اس پار کھڑی دیکھی تھی۔

کروہا اور واسیا جب پانی لے کر پلٹے تو انہوں نے ہنڈیا میں پانی بھرا اور اسے
چولہے پر رکھ دیا۔ سنیو پا ہاتھ میں کف گیر لے کر دھوئیں میں چولہے کے برابر بیٹھ گیا اور
دیگچی میں گرم ہوتے پانی کو دیکھنے لگا کہ کب ابل اوپر آتا ہے۔ پانتلی اور ایمیلیان برابر
برابر چپ بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ دائیموف پیٹ کے بل لیٹا تھا۔ ٹھوڑی تلے
مٹھیاں لگا کر سر اونچا کر رکھا تھا اور آگ کو تک رہا تھا۔ اس کے اوپر ستیو پا کی پرچھائیں
ناچ رہی تھی۔ سو کبھی تو اس کا خوبصورت چہرہ تاریکی میں ڈوب جاتا اور کبھی روشنی میں آ
جاتا۔ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر کروہا اور واسیا ایندھن کے لئے سوکھے گھاس پتے
اور چھال بٹور نے پھر رہے تھے۔ ایگورشکا جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے پانتلی کے برابر کھڑا تھا
اور غور سے دیکھ رہا تھا کہ کس طرح آگ خشک گھاس کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔

سب ہی ستا رہے تھے اور اپنی اپنی کسی سوچ میں گم تھے۔ کبھی کبھی یوں ہی
سرسری طور پہ ان کی نظر صلیب پہ جا پڑتی جس پر لال لال روشنی کے نقش بن رہے تھے۔

کوئی اکیلا مزار ہو تو اس پر عجب حسرت برستی ہے۔ ایک افسردگی کا عالم، ایک انتہائی شاعرانہ فضا۔ آدمی کو اس کی خاموشی کا عجب سا احساس ہوتا ہے اور اس خاموشی سے کچھ ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جو گمنام آدمی اس صلیب تلے دفن ہے اس کی روح یہاں منڈلا رہی ہے کیا اس روح کو سٹیپی میں سکون حاصل ہے۔ کیا وہ چاندنی راتیں اسے اداس نہیں کرتیں۔ اس مزار کے آس پاس سٹیپی افسردہ و مغموم دکھائی پڑتا ہے۔ یہاں سبزہ زیادہ غمناک نظر آتا ہے اور گمان سا ہوتا ہے کہ یہاں ٹڈوں کی جھنکار بھی کسی قدر دبی دبی رہے۔

جو بھی اس راہ سے گزرتا ہے اسے اور اکیلی اس اکیلی بھٹکتی روح کا دھیان آتا ہے وہ مزار کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ دور ہوتا چلا جاتا ہے اور دھند میں گم ہو جاتا ہے۔

"دادا، یہ صلیب کیسی کھڑی ہے" ایگورشکا نے پوچھا۔

پانتلی نے صلیب پر نظر ڈالی پھر دائیموف کو دیکھا اور پوچھا۔

"نکولا، یہ وہ جگہ تو نہیں ہے جہاں گھسیاروں نے بیوپاریوں کا خون کیا تھا؟"

دائیموف نے کسی قدر رک کر کہنی کے بل سر اٹھایا سڑک پر نظر ڈالی اور کہنے لگا "ہاں وہی جگہ ہے ......"

ایک خاموشی چھا گئی۔ کروبا نے چند خشک ٹہنیوں کو توڑا مروڑا اور دیگچی کے نیچے ٹھونس دیا۔ آگ سے پھر شعلے اٹھنے لگے۔ ستیوپک کالے سیاہ دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا اور گاڑیوں کے قریب جہاں کچھ اندھیرا کچھ اجالا تھا صلیب کا سایہ بکھر بکھرا رہا تھا۔

"ہاں ان کا خون ہوا تھا" دائیموف کچھ رکتے رکتے بولا

"دو بیوپاری باپ اور بیٹا سفر میں تھے مقدس مورتیاں بیچنے نکلے تھے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر ایک سرائے ہے جہاں وہ ٹھہرے تھے۔ اب

اس سرائے کو اگنت فومن چلاتا ہے۔ بوڑھے نے زیادہ چڑھالی تھی۔ شیخی بگھارنے لگا کہ میرے پاس بہت رقم ہے۔ ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ بیوپاری لوگ بہت شیخی خورے ہوتے ہیں۔ بس خدا ہی ان سے بچائے...... ہم جیسوں کو دیکھ کر بہت دُون کی لیتے ہیں۔ اس گھڑی اس سرائے میں چند گھسیاروں نے بھی پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ بیوپاری جو ڈینگیں مار رہا تھا اس کی بھنک ان کے کان میں پڑ گئی۔ انہوں نے بات گرہ میں باندھ لی۔"

"اُف خداوند... مقدس ماں" پانتلی نے آہ سرد بھری۔

"دوسرے دن جیسے ہی تڑکا ہوا" دائیموف جاری تھا۔

"بیوپاری چلنے پہ تیار تھے۔ گھسیاروں نے چاہا کہ وہ بھی ساتھ ہولیں۔ قبلہ ساتھ چلتے ہیں۔ اچھا سفر کٹے گا اور خطرہ بھی کم رہے گا...... بیوپاریوں کو آہستہ آہستہ چلنا تھا کہ مورتیاں ٹوٹ نہ جائیں۔ گھسیاروں کو ایسا موقع خدا دے۔"

دائیموف تھوڑا اور اٹھا اور اپنے آپ کو سیدھا کیا۔

"ہاں تو" اس نے جماہی لی اور پھر جاری ہو گیا۔

"اس جگہ تک تو خیریت رہی۔ مگر یہاں گھسیارے اپنی درانتیاں لے کر ان پر پل پڑے۔ بیٹے نے کہ کڑیل جوان تھا ایک کے ہاتھ سے درانتی اچک لی اور لگا چلانے.... مگر وہ آٹھ تھے۔ اسے مار گرایا۔ انہوں نے بیوپاریوں کا قیمہ بنا کے رکھ دیا۔ بدن کا کوئی جو حصہ سلامت رہا ہو۔ جب وہ ان کا کام تمام کر چکے تو انہوں نے انہیں سڑک سے گھسیٹا۔ باپ کو سڑک کے ایک طرف گھسیٹ کر لے گئے۔ بیٹے کو دوسری طرف لے گئے.... اب بھی قبر موجود ہے اس کا مجھے پتہ نہیں..... یہاں سے تو دکھائی نہیں دے رہی۔"

"موجود ہے،" کروہا بولا۔

"کہتے ہیں کہ کچھ ایسی زیادہ رقم ان کے ہاتھ نہیں لگی۔"

"نہیں۔" پانتلی نے تائید کی۔ "بس سو ربل ہاتھ آئے۔"

"اور بعد میں ان میں سے تین چل بسے اس لئے کہ بیوپاری نے بھی انہیں درانتی سے بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ خون بہت بہہ جانے سے مر گئے ایک کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ بغیر ہاتھ کے تین میل تک دوڑتا چلا گیا۔ کرد کوف کے قریب ایک ٹیلے پر مردہ پایا گیا۔ وہ ایڑیوں کے بل بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کا سر اس کے گھٹنوں پہ ٹکا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی خیال میں کھویا ہوا ہے لیکن جب انہوں نے غور سے اسے دیکھا تو اس میں جان ہی نہیں تھی وہ مر چکا تھا۔"

"رستے میں خون کی بوندیں گرتی چلی گئی تھیں۔ ان سے اس کا سراغ ملا۔" پانتلی نے کہا

ایگور شکا نے صلیب پر نظر ڈالی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ جانے کہاں سے شاید کھاڑی کی طرف سے نیند چڑی کی دردناک آواز فضا میں تیرتی ہوئی آئی "سو رہو، سو رہو، سو رہو،"

"دنیا میں سیاہ کار لوگ بہت ہیں۔" ایمیلیان بولا۔

"بہت زیادہ،" پانتلی نے تائید کی اور وہ سرک کر آگ کے بالکل قریب آگیا جیسے وہ ڈر گیا ہو۔

"بہت زیادہ،" وہ دبی سی آواز میں کہنے لگا۔

"میں نے ایسے لوگ بہت دیکھے ہیں، بے حساب ...... سیاہ کار لوگ ...... ویسے میں نے نیک پاک لوگ بھی بہت دیکھے ہیں۔ اے آسمان کی ملکہ، ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھ۔ ہم پہ اپنا کرم کر۔ مجھے یاد آیا

کہ ایک دفعہ، یہ تیس سال پہلے کی بات ہے یا شاید اس سے بھی پہلے کی ہیں
موڑشنسک سے ایک بیوپاری کو گاڑی میں لے کر چلا

یہ بیوپاری اچھا آدمی تھا۔ بہت ہنس مکھ۔ گرہ میں رقم بھی اچھی خاصی تھی۔ . . . .
بھلا آدمی تھا۔ کوئی خرابی نہیں تھی اس میں۔ . . . . تو ہم نے رات کو ایک سرائے میں
پڑاؤ کیا۔ اور روس میں سرائیں اس طرح کی نہیں ہوتیں جس طرح کی ہمارے ان
علاقوں میں ہوتی ہیں۔ وہاں احاطوں پہ چھت ڈال دی جاتی ہے۔ اور وہ نچلی منزل
کی طرح کے نظر آنے لگتے ہیں یا کچھ کھیتوں کی طرح ان کی شکل ہو جاتی ہے۔ بس اتنا ہے
کہ کھتی کی چھت ذرا اونچی ہوتی ہے۔ سو ہم وہاں جا ٹھہرے اور وہ بہت آرام کی
جگہ نظر آئی۔ ہمارا بیوپاری بابو ایک کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں گھوڑوں کی دیکھ بھال
کر رہا تھا۔ سب ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ سو بھئی لڑکو سونے سے پہلے میں نے اپنی رات
کی دعا مانگی اور احاطہ میں چہل قدمی کرنے لگا۔ رات کالی تھی۔ کچھ نظر تو نہیں رہا تھا
اس لئے کچھ دیکھنے بھالنے کی کوشش بھی فضول معلوم ہوئی۔ تو میں نے تھوڑا گاڑی
تک کا چکر لگایا۔ گاڑی تک گیا یا کہیں اس کے آس پاس تھا کہ مجھے روشنی چمکتی نظر آئی۔
یہ کیسی روشنی ہے۔ میں نے سوچا کہ سرائے والے تو خاصی دیر ہوئی سو چکے ہیں اور
سرائے میں مہمان تو اس وقت دو ہی ہیں، بیوپاری بابو اور میں۔ اس کے علاوہ تو
کوئی بھی نہیں ہے. . . . . پھر یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے مجھے طرح طرح کے
شک آنے لگے. . . . . میں ذرا قریب گیا. . . . . جہاں سے روشنی آ رہی تھی
. . . . . . خدا کی پناہ۔ اے آسمان کی ملکہ مجھے اپنی حفظ و امان میں رکھیو۔ میں نے
جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ اس میں جنگلا لگا ہوا تھا. . . . . . .
یہ کھڑکی زمین سے بالکل لگی ہوئی تھی اور گھر کے اندر کھلتی تھی. . . . . . زمین پہ لیٹ کر
میں نے اندر جھانکا۔ میں نے جیسے ہی اندر جھانکا میں تو اندر سے سن ہو گیا۔

کر وہاں تے خشک ٹہنیاں منہ میں لے کر احتیاط سے کہ شور نہ ہو۔ آگ میں جھونک دیں۔
بوڑھے نے تھوڑا انتظار کیا کہ ٹہنیاں چٹخ لیں، پھر شروع ہو گیا۔

" میں نے اندر جھانکا...... وہ تو اچھا بڑا سا تہہ خانہ تھا۔ ایک ٹب پر لالٹین رکھی جل رہی تھی۔ تہہ خانے کے بیچوں وبیچ کوئی بارہ آدمی سرخ قمیص پہنے آستین چڑھائے ملیے ملیے چاقو تیز کر رہے تھے...... اف مارے گئے۔ یعنی ہم ڈاکوؤں کے اڈے میں آن پھنسے تھے......... اب کیا کیا جائے۔ میں دوڑتا ہوا بیوپاری بابو کے پاس گیا اسے چپکے سے جگایا اور کہا بیوپاری گھبراؤ مت۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم پھنس گئے ہیں۔ ہم ڈاکوؤں کے اڈے میں آن پھنسے ہیں وہ تو پیلا پڑ گیا۔ پوچھنے لگا " یا نتکی اب ہم کیا کریں۔ میرے پاس رقم بہت ہے اور یہ سب یتیموں کی ہے۔ باقی رہی اپنی جان تو وہ تو خداوند کے ہاتھ میں ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن یتیموں کا مال مارا جائے یہ بہت زیادتی ہوگی"

.... ہم کیا کر سکتے تھے۔ پھاٹک میں تالا پڑا ہوا تھا۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر باڑھ لگی ہوتی تو اسے پھاند کر نکل جاتے لیکن احاطہ چاروں طرف سے بند تھا۔ میں نے کہا کہ بیوپاری بابو، ڈرو مت۔ خداوند سے دعا کرو۔ رب کریم یتیموں کے مال کی حفاظت کرے گا۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔ ذرا سی بھی آواز نہ ہو۔ میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں..... ٹھیک۔ میں نے رب سے دعا کی اور رب نے میرے دماغ میں ایک بات ڈالی۔ میں اپنی گاڑی پہ چڑھ گیا اور چپکے سے........ بہت چپکے چپکے کہ کوئی سن نہ لے میں نے چھپر میں سے پھونس نکالنا شروع کیا۔ ایک سوراخ کیا اور اس میں سے باہر سٹک گیا......... باہر نکل کر چھت سے نیچے کودا اور سڑک پہ دوڑ لگائی۔ جتنا تیز بھاگ سکتا تھا بھاگا۔ بھاگتا رہا — بھاگتے بھاگتے ادھ موا ہو گیا...... اگر زیادہ نہیں تو چار میل تک ضرور بھاگا ہوں اور بغیر دم لئے۔ خدا خدا کر کے ایک گاؤں دکھائی دیا۔ ایک گھر پہ جا کر کھڑکی کو پیٹنے لگا۔ میں نے

کہا کہ اے اچھے عیسائی لوگو۔ اور پھر میں نے انہیں ساری بپتا سنائی "ایک عیسائی کی جان بچاؤ"۔۔۔۔۔۔۔ میں نے گاؤں کے سارے لوگوں کو جھنجوڑ ڈالا کسان اکٹھے ہو گئے اور میرے ساتھ ہو لئے۔ ایک کے پاس رسی تھی۔ دوسرے نے لٹھ سنبھالا ہوا تھا۔ باقیوں کے پاس بلم تھے۔۔۔۔۔۔۔ ہم پھاٹک توڑ کر اندر گھس گئے اور سیدھے تہہ خانے میں گئے۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکو ابھی ابھی چاقوؤں کو تیز کر کے فارغ ہوئے تھے اور بیوپاری کو مارنے کے لئے جانے والے تھے۔ کسانوں نے انہیں دھر لیا ایک ایک کو پکڑ کے رسی میں باندھا اور لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ بیوپاری نے اس خوشی میں انہیں تین سو روبل انعام دیئے۔ مجھے پانچ سونے کی اشرفیاں دیں۔ اور میرا نام لکھ لیا۔ لوگوں نے بتایا کہ بعد میں اس تہہ خانے سے انسانی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ وہاں ڈھیر لگے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ ہڈیوں کے۔۔۔۔۔۔۔ لوگوں سے مال چھینتے تھے۔ پھر انہیں دفن کر دیتے تھے کہ کسی کو ان کا پتہ ہی نہ ملے۔۔۔۔ خیر بعد میں مورشانسک میں انہیں سزا دی گئی۔"

پانتلی اپنی داستان ختم کر چکا تھا۔ اس نے اردگرد اپنے سامعین پر نظر ڈالی۔ وہ چپ بیٹھے اسے تک رہے تھے۔ پانی نے اب ابلنا شروع کر دیا تھا۔ ستیوپک اس پر سے جھاگ اتار رہا تھا۔

"چربی پک گئی؟" کرو ہانے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

"تھوڑا دم لو۔"

ستیوپک گاڑیوں کی طرف لپک کر چلا۔ لیکن اس کی نظریں پانتلی پر جمی ہوئی تھیں جیسے اسے فکر ہو کہ کہیں اس کے واپس آنے سے پہلے ہی بوڑھا کوئی اور کہانی شروع نہ کر دے۔ لپک کر گیا لپک کر واپس آیا۔ ایک لکڑی کا پیالہ لے کر آیا تھا۔ تھوڑی چربی اس میں ڈال کر کوٹنی شروع کر دی۔

"ایک بیوپاری ہی کے ساتھ ایک اور سفر کی سنو" پانتی پھر شروع ہوگیا۔ اسی طرح دھیمے لہجہ میں اور آنکھ ذرا جو جھپک جائے اس کا نام جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ پیونرگم رگوسج تھا۔ بھلا مانس تھا...... یعنی بیوپاری۔ اسی طرح پھر ہم ایک سرائے میں ٹھہرے۔ وہ کمرے میں۔ اور میں گھوڑوں کے پاس۔ گھر کے لوگ سرائے والا اور اس کی بیوی بھلے لوگ نظر آتے تھے۔ وہاں کام کرنے والے بھی اچھے ہی دکھائی دے رہے تھے لیکن جوانو پھر بھی میرا حال یہ تھا۔ کہ رات بھر سو نہیں سکا۔ میرے دل کو اندر سے کچھ ہو رہا تھا...... کچھ عجب سی دل کی کیفیت تھی۔ پھاٹک کھلا تھا اور آس پاس بہت لوگ تھے۔ پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ سب کو سوئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی کوئی آدھی رات کا وقت ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد سب اٹھ بیٹھنے کو تھے۔ میں اپنی گاڑی میں لیٹا جاگ رہا تھا۔ ذرا جو آنکھ جھپکی ہو جیسے میں کوئی الو تھا۔ اور جوانو، پھر کیا ہوا، مجھے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ کوئی چپکے چپکے گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے سر نکال کر دیکھا۔ ایک دہقانی عورت تھی۔ خالی کرتی پہن رکھی تھی۔ ننگے پاؤں...... میں نے کہا کہ اری نیک بخت کیا چاہتی ہے اور وہ سر سے پیر تک کانپنے لگی۔ چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کہنے لگی بھلے آدمی اٹھ...... ادھر کچھ کھچڑی پک رہی ہے لوگ تیرے بیوپاری بابو کو مار ڈالنے کی فکر میں ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ مالک اپنی بیوی سے کھسر پھسر کر رہا تھا...... اچھا تو یہ بات تھی۔ اس لئے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو کون ہے۔ بولی میں ان کی باورچن ہوں۔ ...... میں اٹھا اور اٹھ کر بیوپاری کے پاس گیا اسے جگایا اور کہا کہ پیونرگم رگوسج، آثار اچھے نہیں ہیں۔ جلدی کرو بس قبلہ جاگ اٹھو۔ جھٹ پٹ کپڑے بدل لو۔ ابھی وقت ہے۔ خیر اسی میں ہے کہ یہاں سے سٹک لیں۔ اس نے جیسے ہی کپڑے بدلنے شروع کئے دروازہ کھلا۔ کیا دیکھا مقدس ماں ہم پہ رحم کرے، دیکھا کہ سرائے والا

ہے، اس کی بیوی ہے اور تین مزدور ہیں ان کے ساتھ۔ تو گویا انھوں نے ان مزدوروں کو یہ تڑی دی تھی۔ کہ بیوپاری موٹی اسامی ہے اس سے جو رقم برآمد ہوگی آپس میں بانٹ لیں گے۔
پانچوں کے ہاتھوں میں "لمبے لمبے" چاقو۔ سرائے والے نے دروازے میں تالا ڈال دیا اور بولا کہ مسافرو، آخری دعا جو مانگنی ہے مانگ لو۔ اور اگر تم نے شور مچایا تو دعا مانگنے سے پہلے ہی تمہارا کام تمام کر دیں گے۔ مگر ہم شور مچانے جوگے کب تھے۔ میرا حلق تو ایسا زندہ گیا کہ آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بیوپاری رو پڑا اور بولا اے میرے اچھے عیسائیو تم نے مجھے اس لئے مارنے کی ٹھانی ہے کہ میرا پیسہ تمہیں للچا رہا ہے۔ اچھا اگر ایسا ہے تو پھر میں پہلا بیوپاری نہیں ہوں نہ آخری ہوں۔ نہ جانے کتنے بیوپاریوں کے سرایوں میں قتل ہو چکے ہیں۔ مگر اچھے عیسائیو تم میرے کوچوان کو بھلا کیوں قتل کر رہے ہو۔ میرے پیسے کی سزا وہ کیوں بھگتے۔ اس نے بڑے درد سے یہ بات کہی۔ سرائے والے نے جواب دیا کہ ہم نے اگر اسے جیتا چھوڑ دیا تو وہ ہمارے خلاف سب سے پہلے گواہی دے گا۔ اگر آدمی ایک کو مار سکتا ہے تو دو کو بھی مار سکتا ہے۔ تم نے سات وارداتیں کی ہوں مگر جواب دہی تو ایک ہی دفعہ کرنی ہے۔ سو دعا مانگ لو تو یہ کر لو۔ بس اتنی ہی مہلت ہے تمہارے لئے زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور بیوپاری دونوں ساتھ ساتھ سجدے میں جھک گئے۔ دعا مانگی توبہ کی۔ اسے اپنے بچوں کا خیال آ رہا تھا۔ میری ان دنوں جوانی تھی۔ . . . میں زندہ رہنا چاہتا تھا . . . . ہم نے شبیہوں کی طرف نظر کی۔ ہم نے دعا کی اور اتنی رڑک رڑک کر دعا کی کہ اب بھی سوچتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اور سرائے والے کی بیوی ہمیں دیکھ کر کہنے لگی کہ بھلے آدمیو اس دنیا سے ہمارے خلاف کوئی کدورت لے کر مت جاؤ۔ اور خداوند سے ہمارے خلاف فریاد مت کرنا ہماری ضرورت ہم سے یہ کام کراتی ہے مگر ہم اسی طرح توبہ و استغفار کرتے رہے اور روتے رہے، تو یہ و استغفار کرتے رہے اور روتے رہے اور آخر خداوند نے ہماری سن لی:

"میرا خیال ہے کہ اسے ہم پہ ترس آ گیا۔ عین اس گھڑی جب سرائے والا بیوپاری کی ڈاڑھی پکڑ کر اس کے گلے پہ چاقو پھیرنے لگا تھا کسی نے اچانک احاطہ میں کھلنے والی کھڑکی کو کھٹکھٹایا۔ ہم سب چونک پڑے اور سرائے والے کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ رہا۔ کوئی کھڑکی کو کھٹکھٹا رہا تھا اور پکار رہا تھا، پیوتر گریگورج، کیا تم یہاں ہو۔ تیار ہو جاؤ۔ بس چلتے ہیں۔ ان لوگوں کو احساس ہوا کہ کوئی بیوپاری کو لینے کے لئے آیا ہے، ایسے سٹپٹائے کہ سر پہ پیر رکھ کر بھاگے...... اور ہم نے جھٹ پٹ بھاگنے کی کی۔ احاطہ میں آ کر گاڑی میں گھوڑا جوتا اور دم کے دم میں وہاں سے نکل لئے۔"

"کھڑکی کس نے کھٹکھٹائی تھی۔" دائیموف نے سوال کیا۔

"کھڑکی کس نے کھٹکھٹائی تھی؟ ...... کوئی ولی ہو گا یا، ہو سکتا ہے کہ کوئی فرشتہ ہو۔ ویسے تو وہاں کوئی تھا نہیں۔ جب ہم احاطہ سے نکلے ہیں۔ تو گلی میں کوئی چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا۔ .... بس خداوند کا کرم تھا۔"

پانتلی نے اور کتنے ہی قصے سنائے اور ہر قصے میں "لمبے لمبے" چاقوؤں کا بہت ذکر تھا اور ہر قصہ گھڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کیا اس نے یہ قصے کسی سے سنے تھے یا اس نے خود کسی بھلے وقت میں گھڑے تھے اور بعد میں جب اس کا حافظہ ضعیف ہو گیا تو اس کے تجربے اس کے تخیل کے ساتھ گڈمڈ ہو گئے۔ پھر وہ تجربے اور تخیل میں فرق کرنے جوگا ہی نہ رہا یوں تو ہر بات ممکن ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس وقت بھی اور باقی سفر میں بھی جب بھی اس نے کوئی قصہ سنایا اد بدا کر داستانی رنگ ہی اپنایا اور یہ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ واردات کیا گزری۔ اس وقت تو ایگورشکا کو سب باتیں سچی معلوم ہوئیں۔ ایک ایک لفظ اسے صحیح نظر آیا۔ بعد میں اسے یہ بات بہت عجیب نظر آئی کہ جس شخص نے اپنے زمانے میں پورے روس کو کھوند ڈالا، جس نے اتنا کچھ دیکھا اور جانا ہے، جس کے بیوی بچے آگ

میں جل کر مر گئے، اس شخص کو اپنی زندگی کے سرمائے کی ذرا بھی قدر نہیں کہ جب بھی سفر میں الاؤ کے گرد بیٹھتا ہے تو یا تو چپ رہتا ہے یا فرضی قصّے سناتا ہے۔

جب وہ شوربہ پی رہے تھے تو بالکل چپ تھے۔ ابھی جو قصّے سنے تھے ان میں کھوئے ہوئے تھے۔ زندگی دہشت ناک بھی ہے اور حیرت ناک بھی۔ رسوروس میں کسی کو تم کیسی ہی دہشت ناک داستان سناؤ، کتنا ہی اس میں قزاقوں چھری چاقوؤں وغیرہ وغیرہ کا مسالہ ڈال دو، سننے والے کی روح اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ کوئی بہت ہی پڑھا لکھا عقل والا ہو وہی ذرا شک کی نظروں سے سنانے والے کو دیکھتا ہے۔ مگر وہ بھی اس کا برملا اظہار نہیں کرتا۔ چپ ہو جاتا ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑی صلیب، اون کی کالی کالی گانٹھیں، میدان کی پھیلی ہوئی وسعتیں، سفری آگ کے گرد جمع لوگ ـــــ اس سب میں اتنی حیرت اور دہشت کا سامان ہے کہ داستانوں اور جن و پری کی کہانیوں کے عجائبات ان کے سامنے گرد نظر آتے ہیں۔

باقی سب تو دیگچی سے نکال نکال کر کھا رہے تھے لیکن پانتلی اوہ سب سے الگ ایک طرف بیٹھا لکڑی کے پیالے میں سے کھا رہا تھا۔ اس کا چمچہ دوسروں کے چمچوں سے مختلف تھا۔ وہ صنوبر کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس پہ ایک صلیب بنی ہوئی تھی۔ ایگوروشکا کو اسے دیکھتے ہوئے اس ننھی شبیہہ والے شیشے کا خیال آ گیا۔ آہستہ سے ستیوپک سے پوچھا:

"دادا سب سے الگ کیوں بیٹھتے ہیں؟"

"دادا پرانے عقیدے کے آدمی ہیں"، ستیوپک اور واسیا دونوں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ اور انہوں نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی جیسے کسی خفیہ عیب یا کمزوری کا ذکر کر رہے ہیں۔

سب چپ بیٹھے تھے اور خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایسے دہشت ناک قصّے سننے کے بعد معمولی روزمرہ کی باتیں کرنے کو ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

اس خاموشی کے بیچ واسیلا نے اچانک جھرجھری لی۔ اس کی بے نور آنکھیں ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہے؟" دائیموف نے پوچھا۔

"کوئی آرہا ہے؟" واسیا بولا۔

"کہاں ہے؟"

"وہ، وہاں۔ کوئی سفید سفید سی چیز ہے۔"

واسیا جس طرف دیکھ رہا تھا اس طرف سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا ہر ایک نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ لیکن کسی کو قدموں کی کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔

"کیا وہ بڑی سڑک سے آرہا ہے؟" دائیموف نے پوچھا۔

"نہیں، میدان سے چلتا ہوا آرہا ہے ...... اس رستے سے آرہا ہے۔"

خاموشی چھا گئی۔ منٹ بھر چھائی رہی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہی بیوپاری ہو جسے یہاں دفن کیا گیا۔" دائیموف کہنے لگا۔

سب نے کنکھیوں سے صلیب کو دیکھا، پھر ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا اور پھر اچانک ایک قہقہہ لگایا۔ اپنے ڈر جانے پر شرمندہ سے تھے۔

"آخر اسے یوں بھٹکتے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔" پانتلی کہنے لگا۔

"بھٹکتی تو وہ روحیں پھرتی ہیں جنہیں زمین قبول نہیں کرتی۔ بیوپاری تو ٹھیک لوگ تھے ...... انہیں تو شہادت کا رتبہ ملا ہے۔"

لیکن ایک ساتھ انہیں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی شخص بھاگتا دوڑتا چلا آرہا تھا۔

"وہ کچھ لے کر آرہا ہے۔" واسیا بولا۔

آنے والے شخص کے قدموں تلے روندتی ہوئی گھاس کی سرسراہٹ اور خشک ٹہنیوں

کی چرچراہٹ تو نہیں سنائی دے رہی تھی لیکن الاؤ کی آگ سے جو روشنی پھیل رہی تھی اس میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خدا خدا کر کے قدموں کی آہٹ قریب آئی اور کوئی شخص کھنکھارا۔ کپکپاتی روشنی بیچ میں سے نکل گئی۔ گاڑی بانوں کی آنکھوں کے سامنے سے جیسے پردہ ہٹ گیا ہو۔ ان کے روبرو ایک آدمی کھڑا تھا۔

یا تو کپکپاتی روشنی اس کی وجہ تھی یا اس وجہ سے یہ ہوا کہ ہر شخص سب سے پہلے اس کی شکل و صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ بہر حال عجب ہوا کہ جب انہوں نے اس پر پہلی نظر ڈالی تو انہیں پہلے نہ تو اس کی صورت نظر آئی نہ لباس دکھائی دیا۔ دکھائی دیا، اس کی مسکراہٹ۔ کیسی خوشگوار۔

بے ساختہ فراخ اور نرم مسکراہٹ تھی جیسے جاگتے پر بچہ مسکراتا ہے اس قسم کی مسکراہٹ جو متعدی ہوتی ہے کہ جواب میں آدمی لاکھ چاہے مسکراہٹ روک نہیں سکتا جب انہوں نے اس اجنبی کو نظر بھر کر دیکھ لیا تب پتہ چلا کہ آدمی خاصا بدصورت ہے اور یہی کوئی تیس کے سن میں ہوگا۔ کسی اعتبار سے بھی اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔ کوچک روس کا رہنے والا تھا۔ لمبا تڑنگا، لمبوتری ناک، لمبے لمبے بازو، لمبی لمبی ٹانگیں، سب ہی اعضا لمبے لمبے تھے سوائے گردن کے جو اتنی کوتاہ تھی کہ لگتا تھا کہ وہ جھکا کھڑا ہے۔ سفید براق قمیص پہن رکھی تھی جس کے کالر پہ کام ہوا تھا۔ سفید ہی پتلون اور نئے جوتے۔ گاڑی بانوں کے مقابلے میں تو وہ چھیلا نظر آرہا تھا۔ بغل میں کوئی بڑی سی سفید سی چیز دابے ہوئے تھا۔ جو پہلی نظر میں بہت عجب نظر آئی۔ اس کے کاندھے کے پیچھے سے ایک بندوق کا کندا بھی نظر آرہا تھا۔

اندھیرے سے روشنی کے حلقہ میں آکر ٹھٹھک گیا بس جیسے جم گیا ہو۔ آدھ منٹ تک گاڑی بانوں کو ایسے دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھو تو سہی میری کس غضب کی مسکراہٹ ہے۔

پھر اس نے آگ کی طرف ایک قدم بڑھایا اب اس کی مسکراہٹ میں اور چمک پیدا ہوگئی۔ بولا۔ "دوستو کچھ نان و نمک کی صورت ہے؟"

"ہاں ہاں، آؤ، بیٹھو" پانتلی نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

اجنبی بغل میں جو چیز داب کر لایا تھا اسے آگ کے پاس رکھ دیا۔ یہ ایک مری ہوئی تلھور تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر ان سے مزاج پرسی کی۔

وہ سب پاس جا کر تلھور کو دیکھنے بھالنے لگے۔

" اچھا پرندہ ہے اور کتنا بڑا ہے۔ تم نے اسے کس چیز سے مارا" دائیموف نے پوچھا۔

" چھرّا لگا ہے۔ چھوٹے کارتوس سے اسے نہیں مار سکتے۔ اس کے زیادہ قریب آپ نہیں جا سکتے دوستو! اسے خرید و گے۔ بیس کوپک میں دے دوں گا۔"

" ہمارے کس کام کی ہے اس کا روسٹ بنایا تو گوشت اتنا سخت ہو جائے گا کہ دانتوں سے چبے گا نہیں۔"

" اچھا، بہت افسوس ہے۔ خیر میں اسے فارم پر لے جاؤں گا۔ وہاں شرفا اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیں گے۔ مجھے آدھا ربل مل جائے گا۔ مگر جگہ بہت دور ہے یہاں سے بارہ میل کا فاصلہ تو ہو گا۔"

اجنبی بیٹھ گیا۔ اپنی بندوق اتار کر اپنے پیچھے رکھ لی۔ لگتا تھا کہ اسے نیند آ رہی ہے۔ بہت الکسا رہا تھا۔ ویسے مسکرا بھی رہا تھا۔ نظریں آگ پر جما رکھی تھیں، لگتا تھا کہ کسی خوشگوار سے خیال میں مگن ہے۔ ان لوگوں نے اسے ایک چمچہ پیش کیا۔ سو وہ بھی کھانے میں شریک ہو گیا۔

" ویسے بھائی تم کون ہو" دائیموف نے پوچھا۔

اجنبی نے سوال سنا ہی نہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ آنکھ اٹھا کر دائیموف کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ اسے شوربے میں بھی کوئی لذت نہیں مل رہی تھی کیوں وہ بڑے بیکانکی انداز میں اسے نوشِ جاں کر رہا تھا۔ چمچہ اٹھا کر جب وہ منہ تک لے جاتا تو کبھی وہ شوربے سے بریز ہوتا اور کبھی خالی ہوتا۔ وہ نشہ میں تو نہیں تھا لیکن یہ ضرور لگتا تھا۔

کہ اس کے دماغ میں کوئی خناس سمایا ہوا ہے۔

" میں پوچھ رہا ہوں کہ تم ہو کون ؟" وائیموف نے پھر پوچھا۔

" میں ؟" وہ اجنبی آدمی تھوڑا چونکا " کانسٹنٹن زفونک ساکن روفنو۔ یہ جگہ یہاں سے تین میل ہے۔"

اور اسے یہ چلنے کی بھی بے چینی ہوئی کہ وہ معمولی قسم کا کسان نہیں ہے بلکہ کچھ حیثیت رکھتا ہے جلدی سے اپنی بات میں اضافہ کیا " ہم لوگ شہد کی مکھیاں اور سور پالتے ہیں۔"

" تم اپنے باپ کے ساتھ رہتے ہو یا تمہارا اپنا گھر ہے۔"

" نہیں میرا اپنا گھر ہے۔ میں الگ رہنے لگا ہوں اسی مہینے سینٹ پیٹرز ڈے کے فوراً بعد میری شادی ہو گئی اب میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری شادی کو اٹھارہ دن ہوئے ہیں۔"

" اچھا کیا۔" پانتلی بولا۔

" شادی اچھا کام ہے . . . . شادی خداوند کی رحمت ہے۔"

" اس کی جوان بیوی گھر میں بند بیٹھی ہے اور وہ سیپی میں مارا مارا پھر رہا ہے۔" کروہا ہنسا۔

" عجب آدمی ہے۔"

جیسے اس کی دکھتی رگ پہ کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو کانسٹنٹن نے جھرجھری لی، ہنسا اور اس کا منہ لال ہو گیا۔

" لیکن وہ تو گھر پہ ہے ہی نہیں۔" منہ سے چمچہ نکال کر جلدی سے بولا اور لطف لیتے ہوئے ایک ایک کو دیکھا

" وہ گھر پہ ہے ہی نہیں تین دن کے لئے ماں کے گھر گئی ہے اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میری شادی ہوئی نہیں ہے۔"

اس نے ہاتھ ہلایا اور سر کو جھٹکا دیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بس اپنے خیالوں میں مگن رہے مگر خوشی اس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ یہ خوشی اس کے خیالوں میں کھنڈت ڈال رہی تھی جیسے اسے بے آرامی ہو رہی ہو۔ اس نے اپنا پہلو تھوڑا بدلا، ہنسا اور پھر ہاتھ ہلایا۔ اس کے اندر جو خوشی سے لبریز خیالات کروٹیں لے رہے تھے ان میں کسی کو شریک کرنے سے اسے حجاب آ رہا تھا لیکن اسی کے ساتھ اس کا بے طرح جی چاہ رہا تھا کہ کسی سے دل کی بات کی جائے۔

" وہ دمودوف گئی ہے ماں سے ملنے کے لئے۔ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑا شرمایا۔ یناوق کو ایک طرف کیا کل آ جائے گی۔ کہتی تھی کہ رات کے کھانے کے وقت تک لوٹ آؤں گی۔"

"تم اس کی کمی تو محسوس کرتے ہو گے" دائیموف کہنے لگا۔

"بہت زیادہ۔ ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی وہ چلی بھی گئی۔ اف . . . . . بہت ہی چنچل ہے۔ میں مر جاؤں کیا غضب کی لڑکی ہے ہنستی ہے تو قیامت ڈھاتی ہے اور کیا خوب گاتی ہے۔ زندگی اس کے اندر سے پھوٹی پڑتی ہے۔ جب سامنے ہوتی ہے تو دماغ چکر کھاتا رہتا ہے اور اب جب وہ گئی ہوئی ہے تو میں احمقوں کی طرح سٹیپی میں مارا مارا پھرتا ہوں جیسے میرا کچھ کھو گیا ہو۔ رات کے کھانے کے وقت سے یہ وقت آ گیا اور میں پھر رہا ہوں۔"

"گویا تمہیں اس سے بہت محبت ہے . . . . . " پانتلی بولا۔

"کیا غضب کی لڑکی ہے۔ قیامت ہے قیامت" کانستنتن نے پھر اپنی بات دہرائی پانتلی کی بات اس نے سنی ہی نہیں "بہت سگھڑ ہے۔ عقلمند۔ ہوشیار۔ اس پورے علاقہ میں ایسی لڑکی چراغ لے کے ڈھونڈو تو نہیں ملے گی۔ گئی ہوئی ہے . . . . .

لیکن مجھے خوب پتہ ہے۔ مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ میں اس ننھی منی نیل کنٹھی کو خوب سمجھتا ہوں۔ جلتے ہوئے کہنے لگی کہ کل آجاؤں گی۔ رات کا کھانا یہیں آکر کھاؤں گی ..... ذرا سوچو تو سہی کتنی عجیب بات ہے؛" کانسٹنٹن کا لہجہ اونچا ہو گیا۔ ساتھ میں اس نے پہلو بدلا۔

"اب وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ میرے بغیر افسردہ ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔"

"کھاتے بھی تو جاؤ" کروہا نے کہا۔

"مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔" کانستنتن نے اس کی سنی ان سنی کی اسی طرح بولے چلا گیا۔

"تین سال سے میں اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے کلا چک کے میلہ میں دیکھا تھا۔ بس اس کا دیوانہ ہو گیا۔ یہ حالت تھی کہ بس چلے تو گلے میں پھندا لگا کر جان دے دوں۔ میں رو فنو میں رہتا ہوں۔ وہ ڈیمیدف کی رہنے والی ہے۔ ہماری بستی سے بیس میل دور۔ میرے بس میں کیا تھا۔ میری طرف سے نائن پیغام لے کے گئی۔ اس نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ اف میری نیل کنٹھی۔ میں کبھی یہ چیز بھیج رہا ہوں۔ کبھی وہ چیز بھیج رہا ہوں۔ کانوں کی بالیاں، قسم قسم کے کیک، بیس پونڈ شہد مگر ادھر سے وہی ایک جواب کہ میں نہیں کروں گی۔ تو یہ قصہ تھا۔ سوچا جائے تو میں اس کے لائق نہیں تھا۔ وہ جوان تھی۔ خوبصورت تھی حرارت سے لبریز۔ ادھر میری عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ میں تیس کا ہونے والا ہوں بکرے کی سی ڈاڑھی چہرے پر مہاسے ہی مہاسے۔ تو میرا اس کا کیا مقابلہ تھا۔ میرے حق میں زیادہ سے زیادہ ایک ہی بات کہی جا سکتی تھی ہم کھاتے پیتے

لوگ ہیں۔ لیکن ڈیرانسکی والے بھی تو کھاتے پیتے
لوگ تھے ان کی ڈیوڑھی پر بیلوں کی تین جوڑیاں بندھی ہوئی تھیں کئی ایک
ملازم بھی تھے۔ بگمہ یارو مجھے محبت کا روگ لگ گیا تھا۔ راتوں کی نیند حرام
ہوگئی۔ بھوک مرگئی۔ ہر وقت خیالوں میں کھویا ہوا۔ پریشان حال خداوند
اس حال سے بچائے برا حال تھا۔ اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپتا تھا۔
وہ ڈیمیدوف میں رہتی تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ خداوند گواہ ہے۔ میں
جھوٹ نہیں بول رہا ہفتے میں تین بار پیدل وہاں جاتا تھا۔ صرف ایک
نظر دیکھنے کے لئے۔ اپنا کام دھام چھوڑ دیا۔ ایسا جنون مجھ پر سوار تھا کہ میں
اس پر بھی تیار تھا کہ ڈیمیدوف میں جاکر مزدوری کرنے لگوں کہ اس طرح
اس سے قرب رہے گا۔ میری ابتر حالت تھی۔ میری ماں نے کوئی بارہ تیرہ
دفعہ جادوگرنی کو بلاکر دکھایا۔ باپ نے مارا پیٹا۔ تین سال تک میں اذیت
میں رہا۔ پھر میں نے طے کیا کہ یہاں سے نکلو اور شہر میں جاکر کوچوانی کرو، ٹم ٹم
چلاؤ۔ ..... مگر شاید قسمت کو یہ منظور نہیں تھا۔ ایسٹر کے دن میں ڈیمیدوف
گیا کہ آخری بار اس کا دیدار کرلوں۔ ..... "
کانستنتن نے اپنا سر پیچھے کی طرف کیا اور کھلکھلا کر ہنسا جیسے اس نے ابھی ابھی کسی کو
مات دی ہے۔

"میں نے اسے دریا کنارے چند لڑکوں کے ساتھ دیکھ لیا" وہ جاری تھا۔
"میں تو غصے سے باولا ہو گیا۔ ...... میں نے اسے بلایا۔ ایک طرف لے گیا
اور خوب سنائیں کوئی گھنٹے بھر تک جو منہ میں آیا کہتا چلا گیا۔ وہ تو مجھ
پہ ریجھ گئی۔ تین سال تک وہ مجھ سے بیزار رہی، اور اب جو میں نے اسے
سنائیں تو وہ مجھ پہ مر مٹی۔"
"تم نے اس سے کیا کہا؟" دایموف نے پوچھا۔

"میں نے کیا کہا تھا۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں . . . . . یاد کیسے رہ سکتی تھی۔ اس وقت تو لفظ میرے منہ سے ایسے نکل رہے تھے جیسے نل سے پانی بہتا ہے۔ سانس لئے بغیر بولے چلا جا رہا تھا۔ اُبل رہا تھا۔ اب اگر چاہوں تو ایک لفظ نہیں بول سکتا . . . . خیر تو اس نے مجھ سے شادی کر لی . . . . . اب وہ اپنی ماں سے ملنے گئی ہوئی ہے۔ نیل کنٹھی۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ بستی میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ میں گھر پہ نہیں ٹک سکتا تھا۔ اتنا مجھ میں صبر نہیں ہے۔"

کانستنتن جس پاؤں کے بل بیٹھا تھا۔ اسے بے ڈھنگے پن سے سیدھا کیا۔ زمین پہ پھیلایا اور دونوں مٹھیوں پہ اپنے سر کو ٹکایا۔ پھر کھڑا ہو گیا اور پھر بیٹھ گیا۔ اب ہر ایک نے سمجھ لیا تھا کہ یہ شخص محبت کر رہا ہے اور اپنی محبت میں مگن ہے اس کی مسکراہٹ، اس کی آنکھیں، اس کی ہر نقل و حرکت سے خوشی ٹپکی پڑ رہی تھی۔ اب تو اسے اپنے لئے کوئی مقام ہی نہیں بچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیف و سرور کے اس غلبہ سے کیسے نکلے۔ جب ان اجنبیوں کے سامنے وہ اپنے دل کا غبار نکال چکا تو پھر آخر کار وہ سکون سے بیٹھا۔ وہ آگ کو تکنے لگا اور خیالوں میں کھو گیا۔

اس آدمی کو خوش دیکھ کر سب افسردہ ہو گئے۔ ان کے یہاں بھی خوشی کی آرزو کنمنانے لگی۔ سب ہی خوابوں میں کھو گئے۔ دابیموف اٹھ کھڑا ہوا۔ آگ کے آس پاس آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اس کی چال اس کے کاندھوں کی حرکت چغلی کھا رہی تھی کہ وہ افسردگی اور حسرت کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ دم بھر کے لئے وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ کانستنتن کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر بیٹھ گیا۔

آگ اب بجھنے لگی تھی۔ اب شعلے نہیں اٹھ رہے تھے۔ ان شعلوں سے روشنی کے جو سرخ سرخ تھالے بن رہے تھے وہ اب بہت چھوٹے رہ گئے تھے اور بہت دھندلا گئے تھے . . . . اور جب آگ بجھ گئی تو چاندنی زیادہ کھلتی چلی گئی۔ اب

انہیں سڑک اپنی پوری چوڑائی میں نظر آرہی تھی، اون کی گانٹھیں گاڑیوں کی چھڑیں، جگالی کرتے گھوڑے سب صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کی پرلی طرف کھڑی دوسری صلیب بھی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔

دائیموف نے اپنا رخسار اپنے ہاتھ پہ ٹکا لیا اور ہولے ہولے ایک درد بھرا گیت گنگنانے لگا۔ کانستنتن ایک غنودگی کے سے عالم میں مسکرایا اور دائیموف کی آواز میں آواز ملانے لگا۔ وہ کوئی ادھ منٹ تک آہستہ آہستہ گاتے رہے پھر ان پر خاموشی طاری ہو گئی۔

ایمیلیان نے ایک جھرجھری لی۔ اپنے بازوؤں کو جھٹکا اور اپنی انگلیاں چٹخانے لگا۔

"لڑکو" اس نے التجا کے لہجہ میں کہا "کوئی مقدس گیت گاؤ" اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے "لڑکو" اس نے پھر اپنی التجا کو دہرایا اور دونوں ہاتھ دل پہ رکھ لئے "کوئی مقدس گیت گاؤ"

"مجھے تو ایسی کوئی چیز یاد نہیں" کانسٹنٹن نے کہا۔

سب ہی نے انکار کر دیا۔ تب ایمیلیان اکیلا ہی شروع ہو گیا۔ اپنے دونوں بازو گھمائے، سر کو تھوڑا جھٹکا دیا، منہ کھولا۔ لیکن حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ ایک بےہنگم تنفس اور بس۔ وہ اپنے بازوؤں سے، اپنے سر سے، اپنی آنکھوں سے گا رہا تھا۔ بلکہ سانس بھی منہ بھی پھلا رہا تھا۔ کتنے جذبے سے کتنے درد سے گا رہا تھا۔ لیکن جتنا اس نے سینہ پہ زور ڈالا کہ کوئی ایک سر تو نکلے اتنا ہی اس کا تنفس بےہنگم ہو گیا۔

دوسروں کی طرح ایگورشکا پر بھی افسردگی طاری تھی۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اوپر چڑھ کر گانٹھوں پر لیٹ گیا۔ آسمان کو تکنے لگا اور خوشی سے سرشار کانستنتن اور اس کی بیوی کے متعلق سوچنے لگا۔ لوگ شادی کیوں کرتے ہیں۔ دنیا میں عورتیں کس لئے ہیں۔ ایگورشکا اپنے آپ سے اسی قسم کے مبہم سے سوال کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ اگر ایک مرد کے ساتھ ایک خوبصورت ہنس مکھ اور شفیق عورت مستقل رہے تو وہ یقیناً خوش رہے گا۔

جانے کیسے اسے کاؤنٹس دراتسکی یاد آگئی۔ سوچنے لگا کہ اگر ایسی عورت کی صحبت میسر آجائے تو کیا کہنے۔

اگر شادی اس کے خیال میں بدمعاشی کی بات نہ ہوتی تو وہ اس سے سمجھ لو کہ ہنسی خوشی شادی کر لیتا۔ اس کی پلکیں، اس کی پتلیاں، اس کی وہ شاندار سواری، اس کا سائیس سب کچھ اس کے تصور میں پھر گیا۔ نرم گرم رات کس نرمی سے اس پر چھا رہی تھی۔ اس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی اور اسے یوں لگا کہ یہ وہی خوبصورت پیاری عورت ہے کہ اس پر جھکی ہوئی ہے، اسے مسکرا کر دیکھ رہی ہے اور اس کا بوسہ لینے پہ مائل ہے۔

اب آگ کا کچھ نہیں بچا تھا۔ بس دو لال انگارہ آنکھیں سی چمک رہی تھیں جو چھوٹی اور چھوٹی ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ کانستنتن اور گاڑی بان راکھ کے برابر بیٹھے تھے۔ بے حرکت کالے کالے ہیولے۔ یوں لگتا تھا کہ ان کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ دونوں ہی صلیبیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ دور بہت دور کہیں شاہراہ کے آس پاس لال لال روشنی چمک رہی تھی۔ شاید کچھ اور لوگ اسی طرح شوربہ تیار کر رہے ہوں۔

کردیا نے اچانک اپنی پھٹے بانس کی سی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

روس ہماری ماں

دنیا کی سرتاج

مگر آواز گلے میں پھنس گئی اور فوراً ہی بیٹھ گئی۔ بہر حال سٹیپی نے اس آواز کو ضائع نہیں جانے دیا۔ فوراً ہی لپک لیا۔ آواز پورے سٹیپی میں گونجتی چلی گئی۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ بہنگم بے معنی لفظ بھاری پہیوں پہ لدے سٹیپی میں لڑھکتے چلے جا رہے تھے۔

پانتلی بولا، "اے لڑکو، اٹھ کھڑے ہو۔ چلنے کا وقت آ گیا۔"

ادھر یہ لوگ گاڑیوں میں گھوڑے جوت رہے تھے اور ادھر کانستنتن ڈوب کر بیوی کی باتیں ان سے کئے چلا جا رہا تھا۔ جب گاڑیاں چل پڑیں تو اس نے پکار کر کہا

"دوستو الوداع۔ تمہاری مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں اس دوسرے الاؤ کی طرف جاؤں گا۔ میرے جذبات میرے اندر نہیں سما رہے ہیں۔"

اور وہ بہت جلدی دھند میں گم ہو گیا۔ دیر تک انہیں فاصلہ میں گم ہوتے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی رہی۔ قدم جو اس دوسری آگ کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ اجنبیوں کی دوسری منڈلی میں بیٹھ کر اپنے مسرت بھرے جذبات اگل کر اپنا جی ہلکا کرے گا۔

اگلی صبح جب ایگورشکا کی آنکھ کھلی تو ابھی بہت سویرا تھا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ گاڑیاں رکی کھڑی تھیں۔ ایک شخص سفید ٹوپی پہنے موٹے چھوٹے کپڑے کا سوٹ ڈائے کاسک کے نر گھوڑے پر سوار سب سے اگلی گاڑی کے برابر کھڑا تھا اور دایموف سے باتیں کر رہا تھا۔ کوئی ڈیڑھ میل آگے نیچی نیچی دیواروں والی سفید سفید کھتیاں دکھائی دے رہی تھیں اور چھوٹے موٹے مکان جن پر ٹائل کی چھتیں پڑی تھیں ان گھروں کے آس پاس درخت اور احاطے قسم کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

"دادا، یہ کونسا گاؤں ہے" ایگورشکا نے پوچھا۔

"یہ ارمینوں کی بستی ہے، ننھے میاں" پانتلی نے جواب دیا۔

اس بستی میں ارمنی لوگ رہتے ہیں۔ بھلے لوگ ہیں۔ ارمنی لوگ"

پانتلی نے بھی اس بستی کی طرف ایک نظر ڈالی۔ صبح کی تازہ ہوا سے اس کے اندر ایک کپکپی دوڑ گئی۔ کہنے لگا۔

"سوچو تو سہی کیا حالت ہے۔ انھوں نے آدمی کو بستی سے کچھ کاغذات لانے کے لیے دوڑایا۔ وہ بندہ خدا ابھی تک نہیں آیا ہے۔ اصل میں ستیوپک کو بھیجنا چاہیئے تھا۔"

"دادا، یہ کون آدمی ہے؟" ایگورشکا نے سوال کیا۔

"ورلموف"

اچھا ورلموف۔ ایگور تشکا جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس سفید ٹوپی کو دیکھنے لگا۔ مشکل ہی سے اس شخص کو پہچانا جاسکتا تھا اس پر اسرار چھلاوا قسم کی شخصیت کو کہ جس کی ہر ایک کو جستجو رہتی ہے، جو ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے کہ ابھی یہاں ابھی وہاں اور جس کے پاس کاؤنٹس درانسکی سے بھی زیادہ دولت ہے۔ بڑے بڑے بوٹ پہنے ہوئے چھوٹا سا آدمی ٹٹو پہ سوار کسانوں سے مصروف گفتگو ہے اس وقت صبح سویرے جب کہ شریف آدمی اس وقت بستر پہ محو خواب ہوتے ہیں۔

"اس کے یہاں کوئی گھپلا نہیں ہے۔ نفیس آدمی ہے۔" پانتلی بستی کی طرف نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ "خداوندا اسے زندہ و تندرست رکھے، شاندار آدمی ہے سیمیاں الیکزنڈرووچ ایسے ہی لوگوں کے دم سے تو دنیا قائم ہے ..... صحیح بات ہے ..... ابھی تو مرغوں نے بھی بانگ نہیں دی ہے مگر یہ شخص اٹھا ہوا ہے اور گشت پر ہے اور کوئی ہوتا تو اس وقت سو رہا ہوتا یا گھر میں آئے مہمانوں سے گپ بازی کر رہا ہوتا۔ لیکن وہ سارا سارا دن سیپی میں گزارتا ہے اور گشت پہ ہوتا ہے کسی معاملہ کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دیتا.... بالکل نہیں کمال کا آدمی ہے۔

ورلموف کچھ بول رہا تھا۔ آنکھیں اس کی ایک جگہ جمی ہوئی تھیں۔ اس کی رانوں کے بیچ وہ چھوٹا سا ٹٹو بے چین ہو کر کبھی ایک ٹانگ پر زور ڈالتا تھا کبھی دوسری پہ۔

"سیمیاں الیکزنڈرووچ صاحب"، پانتلی نے اپنا ہیٹ اتار کر اونچی آواز سے کہا "آپ فرمائیں تو سنیبوپک کو بھیجا جائے۔ ایمیلیان، سنیبوپک سے کہو کہ وہ ذرا جلدی..."

مگر آخر کار بستی کی طرف سے ایک شخص گھوڑے پہ سوار آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک طرف کو بالکل جھک گیا تھا۔ ایک کاکیشائی جیالے کی شان سے ہاتھ سر سے اونچا کر کے چابک گھما رہا تھا اور اس طرح اپنی شہسواری کی شان دکھا کر دیکھنے والوں کو حیران کر دینے پہ تلا نظر آتا تھا۔ سو اس ادا کے ساتھ وہ نمودار ہوا اور ایک عقابی شان کے ساتھ تیزی سے گاڑیوں کی طرف اڑا چلا گیا۔

پانسکی کہنے لگا "یہ تو اس کی جاگیر کا کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے اس کے یہاں ایسے ایسے سو گھڑ سوار تو ہوں گے یا کیا پتہ ہے زیادہ ہی ہوں۔"

پہلی گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں، سر سے ادب کے ساتھ ہیٹ اتارا اور ایک کتابچہ ورلموف کی خدمت میں پیش کیا۔ ورلموف نے اس کتابچہ میں سے کئی کاغذ نکال کر پڑھے اور چلایا،

"ایوان چک کا رقعہ کہاں ہے؟"

گھڑ سوار نے کتابچہ واپس لے کر الٹا پلٹا، مختلف کاغذوں کا جائزہ لیا اور کاندھے جھکا کر کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ شاید اپنی چوک کے جواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور پھر بستی کی طرف جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ ٹٹو نے ایک دم سے جھرجھری لی گویا ورلموف کا بوجھ اس کی پیٹھ پر زیادہ ہو گیا ہو۔ ساتھ میں ورلموف نے بھی جھرجھری لی۔

"فوراً جاؤ۔" ورلموف غصہ میں آکر چیخ پڑا۔ اور اس کی طرف رخ کر کے ہنٹر کو گھمایا۔

پھر اس نے اپنے ٹٹو کا رخ پھیرا اور کتابچہ میں رکھے ہوئے کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے گاڑیوں کے برابر برابر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جب وہ بالکل پیچھے پہنچ گیا تو ایگور شکا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا کہ اسے اچھی طرح دیکھ لے۔ عام سا روسی چہرہ۔ کچھ سنولایا ہوا کچھ لال لال چھلکیا بھوری ڈاڑھی۔ چہرہ اوس سے بھیگا ہوا تھا اور نیلی نیلی رگیں ابھری نظر آ رہی تھیں، اس چہرے پر وہی کاروباری قسم کی خشکی نظر آ رہی تھی جو ایوان ایووچ کے چہرے پر نظر آتی تھی اور بالکل ویسا ہی کاروباری جوش و جذبہ۔ اس کے باوجود اس کے اور کز میشوف کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ ماموں ایوان ایووچ کے چہرے پر تو ایک کاروباری روکھے پھیکے پن کے باوجود ایک پریشانی طاری رہتی ہے۔ اور فکر و اندیشہ کی کیفیت کہ پتہ نہیں ورلموف سے اس کی ملاقات ہو پائے گی یا نہیں کہ شاید اسے پہنچنے میں دیر ہو جائے، کہ شاید اس کا مال اچھی قیمت پر نہ اٹھے۔ ورلموف کے چہرے سے ایسی کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ایسی پریشانیوں اور فکروں میں تو چھوٹے بیوپاری مبتلا رہتے ہیں۔ یہ شخص تو نرخ خود مقرر کرتا

تھا۔ برزخ کے تعین کے لئے وہ کسی دوسرے کا محتاج تھوڑا ہی تھا۔ ظاہر میں تو وہ عام سا آدمی نظر آتا تھا لیکن اس کی ہر ادا سے حتیٰ کہ ہنٹر پکڑنے کے انداز سے بھی صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کے یہاں طاقت کا ایک احساس ہے اور یہ احساس کہ یقینی پر۔ اس کا اختیار ہے۔

ایگورنشکا کے برابر سے گزرتے ہوئے اس نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بس اس چھوٹے ٹٹو نے اسے اپنی توجہ سے نوازا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی احمقانہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا لیکن اس کے بارے میں زیادہ دلچسپی اس نے بھی نہیں لی۔ پانتلی نے جھک کر بڑے ادب سے ورلموف کو سلام کیا۔

ورلموف نے اس کا تھوڑا نوٹس لیا۔ کاغذات پر اس کی نظریں تو اسی طرح جمی رہیں بس اسی عالم میں پوچھ لیا۔

"بڑے میاں کیسے ہو"

ورلموف نے گھڑ سوار سے جس طرح بات کی تھی جس طرح اسے ہنٹر دکھایا تھا۔ اس کا ان سب ہی لوگوں پر بہت رعب پڑا تھا۔ سب چپ چپ نظر آ رہے تھے۔

گھڑ سوار تو اس مقتدر شخصیت کے غیظ و غضب سے بالکل ڈھے گیا تھا۔ سب سے آگے والی گاڑی کے برابر گم سم کھڑا تھا۔ سر سے ہیٹ اتارا ہوا تھا اور لگام ہاتھ میں ڈھیلی ہو رہی تھی۔ یہ خیال اس کے لئے کتنا تکلیف دہ تھا کہ آج کا دن اس کے لئے برا چڑھا ہے۔

"بوڑھا بہت تند مزاج ہے۔" پانتلی بڑبڑانے لگا۔

"افسوس کی بات ہے کہ وہ اتنا تند مزاج ہے۔ مگر آدمی ٹھیک ہے۔ خدا ترس ہے، اس کا غصہ بجا ہے۔۔۔۔"

ورلموف نے کاغذات کو دیکھنے بھالنے کے بعد کتابچہ کو جیب میں ٹھونس لیا۔ ٹٹو نے جیسے بھانپ لیا ہو کہ مالک کی کیا مرضی ہے۔ اس نے حکم کا بھی انتظار نہیں کیا۔ بس چل پڑا اور شاہراہ پر دوڑنا شروع کر دیا۔

(۷)

اگلی رات گاڑی بانوں نے پھر پڑاؤ کیا اور اپنا دال دلیا پکانا شروع کیا۔ آج سب ہی بہت نڈھال تھے۔ گرمی بہت تھی۔ سب ہی بے تحاشا پانی پی رہے تھے لیکن پیاس تھی کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ چاند سرخ ہو رہا تھا۔ اس پہ ایک نحوست سی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ بیمار ہے۔ وہی نحوست ستاروں پر بھی منڈلاتی نظر آتی تھی۔ دھند بہت تھی۔ دور و نزدیک دھندلے دھندلے تھے، کل کی نسبت زیادہ دھندلے۔ فطرت پر ایک پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ کسی برے شگن کے بوجھ تلے کراہ رہی ہے۔

سفری چولہا گرم تھا۔ لیکن آج اس کے گرد وہ زندگی وہ گپ بازی کی فضا نظر نہیں آتی تھی جو کل تھی۔ سب پہ ایک مردنی طاری تھی۔ جو بات کرتے تھے بڑی بیدلی سے کرتے تھے۔ پانتلی ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور اپنے پیروں کا دکھڑا رو رہا تھا۔ بار بار موت کا ذکر بیچ میں لے آتا تھا۔

دائیموف ہیٹ کے بل لیٹا ایک تنکا چبا رہا تھا۔ برا سامنہ بنائے ہوئے تھا جیسے تنکے کی باس اسے اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ نظریں اس کی تھکی تھکی تھیں۔......واسیا رونا رو رہا تھا کہ اس کے جبڑے میں درد ہو رہا ہے۔ ساتھ میں موسم کی خرابی کی پیشگوئی کرتا جاتا تھا۔ ایمیلیان کے بازو اس وقت گردش میں نہیں تھے۔ چپ چاپ بیٹھا تھا اور غمناک نظروں سے آگ کو تک رہا تھا۔ ایگورشکا پہ بھی ایک درماندگی طاری تھی اس

اس اونگھتے رینگتے سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے اثر سے اس کے سر میں درد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ادھر دلیا پک رہا تھا اور ادھر وائیموف کو بوریت سے نجات کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے رفیقوں سے لڑنا شروع کر دیا۔ ایملیان کو حقارت بھری نظر سے دیکھا اور کہنے لگا۔

"اس گٹھل شکل کو دیکھو۔ ویسے اینڈتا رہتا ہے مگر کھانے کے وقت سب سے پہلے اس کا چمچہ چلتا ہے۔ ندیدا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی ترکیب سے ہنڈیا کے پاس اڑ کر بیٹھتا ہے۔ گرجا گھر میں حمدیں گاتا رہا ہے اس بنا پہ اپنے آپ کو شریف آدمی سمجھا بیٹھا ہے۔ ارے تجھ جیسے کتنے حمد گانے والے سڑکوں پہ بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔"

ایملیان نے غصے سے اسے دیکھا اور بولا

"کس لئے مجھے تنگ کر رہا ہے؟"

"تجھے یہ سمجھانے کے لئے کہ ہنڈیا پہ سب سے پہلے ہاتھ صاف کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اپنے آپ کو تو سمجھتا کیا ہے؟"

ایملیان بھنبھنا کر بولا "تو احمق ہے سمجھا؟"

پانتلی اور واسیا کو تو تجربہ تھا کہ اس قسم کی گفتگو کا انجام کیا ہوتا ہے۔ سو وہ دونوں بیچ میں پڑ گئے اور وائیموف کو سمجھانے لگے کہ بلا وجہ لڑنے میں کیا رکھا ہے۔

وہ لڑاکا آدمی اس طرح رکنے والا تھوڑا ہی تھا حقارت سے ہنسا اور کہنے لگا۔

"گرجا گھر کا گویا۔ ارے ایسا تو ہر کوئی گا سکتا ہے۔ گرجا گھر کی ڈیوڑھی میں جا بیٹھ اور صدا لگانی شروع کر دے۔ عیسیٰ مسیح کے نام کا کچھ دیتے جاؤ، ہوں۔ تو بھی کیا آدمی ہے۔"

ایملیان بولا ہی نہیں۔ اس کی خاموشی سے وائیموف اور چڑ گیا۔ اس نے اس سابق

گویئے کو اور زیادہ نفرت بھری نظر سے دیکھا اور بولا "میں تو تجھے گانٹھتا ہی نہیں ورنہ بتاتا کہ تیری اوقات کیا ہے۔"

"مردود تو چاہتا کیا ہے؟" ایمیلیان غصے سے ابل پڑا "آخر میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

"کیا کہا۔ ذرا پھر کہیو" دائیموف تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے خون برسنے لگا "میں؟ ۔۔۔۔۔ میں مردود ہوں؟ ۔۔۔۔ یہی کہا تھا؟ ۔۔۔۔۔ اچھا تو لے بتاتا ہوں۔"

دائیموف نے اس کے ہاتھ سے چمچہ چھین کر دور پرے پھینک دیا "جا ڈھونڈتا پھر" کردوہا، واسیا اور ستیوپک دوڑ پڑے اور سرگرمی سے چمچے کو ڈھونڈنے لگے۔ ادھر ایمیلیان فریادی نظروں سے پانتلی کو تک رہا تھا۔ اچانک اس کا چہرہ سمٹ سا گیا۔ ایک تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

ایگورشکا تو پہلے ہی دائیموف سے متنفر تھا اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہوا رک گئی ہے، اور اس کا دم گھٹا جا رہا ہے اور جیسے آگ سے اس کا چہرہ جھلسا جا رہا ہو۔ اس کا جی چاہا کہ بس فوراً یہاں سے دوڑ لگائے اور اندھیرے میں بھاگ کر گاڑیوں پہ چلا جائے مگر اس لڑاکا شخص کی خشمگیں بیزار کن نظروں کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کے اندر ایک ابال اٹھا۔ ایک بے پناہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسے کوئی سخت سی گالی دی جائے۔ ایک قدم دائیموف کی طرف بڑھا اور لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بولا "تو بہت کمینہ ہے۔ مجھے تیری صورت بری لگتی ہے۔"

اس کے بعد اسے واقعی گاڑیوں کی طرف چلا جانا چاہیے تھا۔ مگر اب وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہا تھا۔ کہنے لگا "عاقبت میں جا کر تو دوزخ میں جلے گا۔ تو کون ہوتا ہے ایمیلیان کو برا بھلا کہنے والا میں ماموں ایوان ایونچ سے کہوں گا۔"

"ضرور کہنا۔ اور ہاں یہ بھی کہہ دینا" دایموف نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا "کہ سور کے بچے دودھ پیتے ہوئے چوں چوں کی آوازیں بہت نکالتے ہیں..... اینٹھوں تیرے کان"

ایگورشکا کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا تو وہ عالم ہوا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سارا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ زمین پہ پیر پٹخنے شروع کر دیئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا"

"مارو۔ اس آدمی کو مارو۔"

آنکھوں سے اس کی آنسو چھلک پڑے۔ اس پر اسے بہت شرم آئی۔ بھاگ کھڑا ہوا۔ لڑکھڑاتا لڑکھڑاتا گاڑیوں پہ پہنچا۔ اس کے پھٹ پڑنے کا ان لوگوں پر کیا اثر ہوا، یہ تو وہ دیکھ ہی نہیں سکا۔ گانٹھوں پر لیٹا اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو بل دے رہا تھا اور چپکے چپکے کہہ رہا تھا "ماں۔ ماں"

اور سفری آگ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ اور ان کی پرچھائیاں اور اون کی کالی کالی گانٹھیں اور دور چمکتی ہوئی بجلی کہ بار بار لہرا رہی تھی۔ یہ سب کچھ اسے اس وقت بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ یہ ساری فضا اسے دشمن نظر آ رہی تھی۔ اسے ایک خوف نے آ لیا۔ سخت ناامیدی کے عالم میں دل ہی دل میں کہنے لگا کہ وہ اس انجانی دنیا میں ان خوفناک کسانوں کے بیچ کیسے آن پھنسا ہے اور کیوں؟ اس وقت اس کے ماموں جان کہاں ہیں۔ کرسٹفر پادری کہاں ہیں۔ دینیسکی کہاں ہے۔ انھوں نے آنے میں اتنی دیر کیوں کی وہ اسے بھول تو نہیں گئے ہیں۔ جیسے ہی اسے یہ خیال آیا کہ اسے بھلا دیا گیا ہے اور قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے تو اس کے اندر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کئی ایک دفعہ ایک جھرجھری سی آئی کہ اون کی گانٹھوں سے نیچے چھلانگ لگائے اور بھاگ کر تیر کی طرح سڑک پر ہو لے لیکن رستے میں کھڑی اونچی اونچی کالی صلیبوں اور دور چمکتی بجلی کے

خیال نے اسے روک روک لیا......... بس جب اس نے ہوبے ہوبے 'ماں، ماں' پکارا تب اسے تھوڑی ڈھارس ہوئی۔

گاڑی بان بھی شاید کچھ ڈر گئے تھے۔ ایگور شکا جب الاؤ سے اُٹھ کر چلا آیا تو وہ پہلے تو دیر تک گم سم بیٹھے رہے پھر کھوکھلی آوازوں میں ہوبے ہوبے کچھ کہنے لگے اس قسم کی بات کہ کچھ ہونے والا ہے، سو اس سے پہلے کہ کچھ ہو جائے انہیں یہاں سے جھٹ پٹ نکل لینا چاہیئے......... انہوں نے خاموشی سے کھانا ختم کیا، آگ بجھائی اور گاڑیوں میں گھوڑے جوتنے شروع کر دیئے۔ ان کی ہبڑ دبڑ ان کے اکھڑے اکھڑے جملے چغلی کھا رہے تھے کہ انہیں یہ ڈر ہے کہ کوئی مصیبت کھڑی ہونے والی ہے۔

وہ چلنے کو تھے کہ دایموف نے پانتلی سے آکر دھیرے سے پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟"

"ایگوری" پانتلی نے جواب دیا۔

دایموف نے ایک پاؤں پہیے پہ رکھا، رسی کو پکڑا جو اون کی گانٹھوں کے گرد بندھی ہوئی تھی اور اوپر چڑھ گیا۔ ایگور شکا کو اس کا چہرہ اور گھنگھریالے بال دکھائی دیئے۔ چہرہ پیلا ہلدی ہو رہا تھا اور ایسا جیسے نچڑ گیا ہو۔ مگر کوئی نفرت کی کیفیت دکھائی نہیں دیتی تھی۔

"ایگور" اس نے دھیرے سے کہا "یہ رہا میں۔ مجھے مار"

ایگور شکا اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ٹھیک اسی آن بجلی چمکی۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے مار" دایموف نے پھر کہا اور اس سے پہلے کہ ایگور شکا واقعی اسے مارے یا منہ سے کچھ بولے وہ نیچے کود گیا اور کہنے لگا "میں کتنا مکروہ ہوں"

جھومتا لڑکھڑاتا کبھی اس ٹانگ پہ کبھی اس ٹانگ پہ، کاندھوں کو جھکاتا گاڑیوں کے برابر برابر چلا جا رہا تھا اور کچھ روہانسی کچھ غصیلی آواز میں بار بار کہہ رہا تھا "خداوندا میں کتنا مکروہ آدمی ہوں" اور ایمیلیان کے برابر سے گزرتے گزرتے بولا "ایمیلیا، میری

بات کا برا مت مان۔ ہم ستم رسیدہ لوگ ہیں۔ ہماری زندگیاں ایک عذاب ہیں عذاب۔"

دائیں سمت میں روشنی کا ایک کوندا لپکا۔ اور جیسے روشنی آئینہ پر پڑے تو ایک چکا چوند پیدا ہوتی ہے بس اسی طرح سے فوراً دور فاصلہ پر ایک چکا چوند پیدا ہوئی۔

پانتلی نے کوئی بڑی سی کالی سی چیز ایگوری کی طرف پھینکی "ایگوری، یہ لو"

"کیا چیز ہے؟" ایگورنشکا نے سوال کیا۔

"چٹائی ہے بینہ پڑنے والا ہے۔ اسے اوڑھ لینا"

ایگورنشکا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ اب دور و نزدیک کے فاصلے بہت کالے ہو گئے تھے اور بار بار ایک ایک منٹ بعد ہلکی سی چمک پیدا ہوتی تھی بیاہی جیسے اپنے ہی بوجھ سے دائیں سمت میں کھسکتی جا رہی ہو۔

ایگورنشکا پوچھنے لگا "دادا کیا طوفان آنے والا ہے؟"

"اُف میرے پاؤں ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں" پانتلی نے ایگورنشکا کی بات کو سنی ان سنی کی۔ بس اپنے پیر پٹخنے لگا اور درد سے چلانے لگا۔

بائیں سمت میں یوں لگا جیسے کسی نے آسمان کو دیا سلائی دکھائی ہو۔ ہلکی سی روشنی کی ایک دھاری جھلملائی اور بجھ گئی۔ پھر کچھ اس قسم کی آواز پیدا ہوئی جیسے کہیں دور کوئی کسی آہنی چھت پر چل رہا ہے۔ شاید ننگے پاؤں کیونکہ آہنی چھت کھڑ کھڑ کر رہی تھی۔

دائیں سمت میں پھیلے فاصلوں اور افق کے بیچ بجلی اتنی تیز چمکی کہ سٹیپی کا بڑا حصّہ جگمگا اُٹھا اور ساتھ میں وہ مقام بھی جہاں صاف آسمان اور کالی گھٹا گلے مل رہے تھے ڈراؤنی گھٹا آہستہ آہستہ اُمنڈتی چلی آ رہی تھی۔ دل بادل جن کے کناروں پہ سیاہی کے گچھے سے بنے ہوئے تھے۔ اسی طرح کے کالے کالے گچھے دھکم پیل کرتے دائیں بائیں اُفق پر اُمنڈ رہے تھے۔ گھٹا جھوم کے اُٹھی تھی کچھ اس ڈھنگ سے جیسے کوئی بدمست شرابی

جھومتا لڑکھڑاتا چلا آرہا ہو۔ اور بادل کس تیزی سے گرج رہے تھے۔ ایگورُشکا نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور جلدی سے اوور کوٹ پہن لیا۔

"میں مکروہ آدمی ہوں"، دائیموف کی چیخ و پکار سب سے آگے والی گاڑی سے ہوا کے ساتھ تیرتی چلی آرہی تھی۔ یہ آواز سن کر قیاس کیا جا سکتا تھا کہ دائیموف کی چڑچڑاہٹ پھر زور پکڑ رہی ہے۔ "میں کتنا مکروہ آدمی ہوں"

اچانک ہوا سیٹیاں بجانے لگی۔ ہوا اتنی تیز اور تند تھی کہ ایگورُشکا کی پوٹلی اور چٹائی دونوں کو اڑائے لئے جا رہی تھی۔ چٹائی اپنے چاروں کونوں کے ساتھ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اوپر اٹھ اٹھ کر پٹاخ سے اون کی گانٹھ اور ایگورُشکا کے چہرے پر گرتی تھی۔ ایک آندھی تھی کہ پورے سٹیپی میں بھنگم سے انداز میں چکر کھاتی سیٹیاں بجاتی چل رہی تھی اور گھاس سے گزرتے ہوئے اتنا شور پیدا کر رہی تھی کہ اس شور میں اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا، نہ بادلوں کی گرج نہ گاڑیوں کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ، وہ کالے طوفانی سے بادل کی مثال اٹھی تھی اور گرد کے دل بادلوں کے ساتھ بارش اور گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو لے کر آرہی تھی۔ چاندنی اور زیادہ دھندلا گئی تھی۔ گرد میں جوات گئی تھی۔ ستارے بھی اب کچھ زیادہ ماند پڑ گئے تھے اور گرد کے دل کے دل یہاں سے وہاں تک سڑک کے کنارے کنارے بھاگتے دوڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پیچھے ان کے سائے دوڑ رہے تھے اور اب بگولے بھی اُٹھنے شروع ہو گئے تھے کہ چکر کاٹتے ہوئے زمین سے گھاس پھونس اور پرندوں کے پر اپنی لپیٹ میں لے کر اس تیزی سے اوپر جا رہے تھے جیسے آسمان ہی پہ جا کر دم لیں گے۔ اس کالے طوفانی بادل کی زد میں آکر کتنے پودے جڑوں سے اکھڑ کر اڑے چلے جا رہے ہوں گے اور کتنے ڈرے سہمے ہوں گے۔ اس گرد و غبار دیں کہ آنکھوں میں گھسا جا رہا تھا سوائے بجلی کی چمک کے کچھ بھی تو نظر نہیں آرہا تھا۔

ایگورُشکا نے جانا کہ بس گھڑی بھر میں مینہ پڑنا شروع ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ جھکا اور چٹائی کو

اپنے اوپر لے لیا۔

"پانتلی رے........" کہیں سامنے سے کسی نے اونچی آواز سے پکارا "اے... رے

.... رے رے"

"مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا" پانتلی نے اتنی ہی اونچی آواز میں پکار کر کہا۔

"آ...... آ...... آ......."

بجلی ایک غضب کے ساتھ کڑکی اور دائیں سمت سے بائیں سمت آسمان پر تڑپتی چلی گئی۔ پھر پلٹ کر آئی اور سب سے آگے والی گاڑی کے اوپر پہنچ کر معدوم ہو گئی۔

"اے ہمارے مقدس مقدس خداوند" ایگورشکا نے سینہ پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے ہوئے دعا مانگنی شروع کی "زمین و آسمان کو اپنی جلالی شان سے منور کر دے"

کالے بھنور آسمان نے اپنا بڑا سا منہ کھولا اور ایک آتشیں سانس لیا۔ اسی آن پھر ایک کڑک پیدا ہوئی۔ اور ابھی کڑک تھمی ہی تھی کہ بجلی چمکی اور اس کا کوندا اتنی دور تک گیا کہ ایگورشکا کو چٹائی کی ایک درز میں سے اچانک ساری سڑک افق تک دکھائی دے گئی اور ساری گاڑیاں اور کرد بلا بھی معہ اپنی واسکٹ کے۔ کالی بدلیاں اب بائیں سمت سے اوپر کی سمت منڈلاتی نکل گئی تھیں۔ ایک بدلی کچھ عجیب بدشکل اور ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی پنجہ ہے جس میں لمبی لمبی انگلیاں ہیں اور یہ انگلیاں چاند کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ایگورشکا نے فیصلہ کیا کہ بس اپنی آنکھیں زور سے بند کر لی جائیں اور اس کی طرف دیکھا ہی نہ جائے اور اس وقت تک بند رکھی جائیں جب تک یہ سارا طوفان گزر نہ جائے۔

مینہ پڑنے میں جانے کیوں دیر ہو رہی تھی۔ ایگورشکا نے چٹائی کی درز سے جھانک کر دیکھا اس کا خیال تھا کہ شاید اب طوفانی گھٹا اس کے اوپر سے گزر رہی ہو گی۔ سخت

کالی گھٹا تھی کہ دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس اندھیرے میں ایگورشکا کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا، نہ پانتلی نہ اون کی گانٹھیں۔ حتیٰ کہ اسے اپنا آپا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اس طرف نظر ڈالی جہاں اب سے تھوڑی دیر پہلے چاند چمک رہا تھا لیکن اب وہاں بھی ویسا ہی گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا جیسا گاڑیوں پر چھایا ہوا تھا اور اس اندھیرے میں بجلی کی چمک میں اور زیادہ سنہری پیلا ہو گئی تھی۔ آنکھیں اس سے اور زیادہ چندھیانے لگی تھیں، اتنی کہ آنکھوں کو تکلیف ہونے لگی تھی۔

ایگورشکا پکار اٹھا "پانتلی"

جواب ندارد لیکن ہوا کا ایک جھکڑ آیا، چٹائی کو اڑا کر ادھر پھینکا اور گزر گیا۔ اس طوفانی آندھی کا یہ آخری جھکڑ تھا۔ اس کے بعد اس شور میں اک ٹھہراؤ آگیا۔ ایک بڑی سی ٹھنڈی ٹھنڈی بوند ایگورشکا کے گال پر ٹپ سے گری۔ دوسری اس کے ہاتھ پر گری اور اسے تربتر کر دیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس کے گھٹنے کھلے ہوئے ہیں۔ اس نے چٹائی کو پھر سے سیدھا کر کے اوڑھنے کی کوشش کی مگر عین اس گھڑی سڑک پر ٹپا ٹپ کا شور ہوا پھر یہی شور اون کی گانٹھوں پر اور گاڑیوں کے ڈنڈوں اور بموں پر سنائی دیا۔ مینہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ جیسے مینہ اور چٹائی ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہوں دونوں نے مل کر اس طرح شور کرنا شروع کیا جیسے دو نیل کنٹھ مزے میں آکر خوب تیز تیز ٹائیں ٹائیں کر رہے ہوں۔

ایگورشکا جھک گیا بلکہ یوں کہئے کہ اپنے بوٹوں کے بل سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اسی عالم میں کہ مینہ چٹائی پر موسلا دھار پڑ رہا تھا۔ اس نے آگے کو جھک کر چٹائی سرکائی اور گھٹنوں کو ڈھانپ لیا۔ جو دم کے دم میں پانی میں تربتر ہو گئے تھے۔ وہ گھٹنوں کو ڈھانپنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر منٹ بھر ہی میں اسے یوں لگا کہ اس کی پشت اور پنڈلیوں میں ایک ناخوشگوار سی تری اترتی پیوست ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے پھر وہی اپنی پچھلی

والی پوزیشن لے لی۔ یعنی اس کے گھٹنے پھر ملینہ کی زد میں تھے۔ وہ سخت حیران و پریشان تھا کہ چٹائی کو کس طرح پھر سے درست کرے۔ اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر اس کے بازو تو پہلے ہی پانی میں شرابور ہو چکے تھے۔ اب پانی رس رس کر اس کی آستینوں میں اور اس کے کالر کے اندر جا رہا تھا اور اس کے کھووں میں ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی اور اس نے طے کیا کہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، چپ چاپ بیٹھے رہو اور مینہ کے رکنے کا انتظار کرو۔ ہولے ہولے خداوند کو یاد کرنے لگا اے مقدس خداوند، اے مقدس خداوند، اے مقدس خداوند۔

اچانک عین اس کے سر کے اوپر آسمان میں اس زور کی کڑک پیدا ہوئی کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ وہ دبک گیا اور یہ حال ہوا کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے اسے لگا کہ اس پر ملبہ اب گرا کہ اب گرا۔ اس نے نادانستہ آنکھیں کھولیں کیا دیکھا کہ ایسی تیز روشنی ہوئی ہے کہ آنکھیں چندھیا جائیں۔ پانچ مرتبہ ایک چکا چوند ہوئی کہ اس کی انگلیاں، اس کی شرابور آستینیں، چٹائی سے ٹپکتا پانی کہ اس کی گانٹھوں کو بھگوتا ہوا زمین پر گر رہا تھا۔ سب چمک اٹھیں بجلی ایک مرتبہ پھر کڑکی اتنی ہی تندی سے اتنے ہی خوفناک تیوروں سے آسمان پہ اب نہ گرج تھی نہ گڑگڑاہٹ تھی۔ بس ایسی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں جیسے سوکھی لکڑیاں چٹخ رہی ہوں۔

تڑ تڑ تڑ تڑ، بجلی کی کڑک کتنی واضح تھی۔ آسمان پر کس طرح لوٹی پوٹی ہے پھر یوں لگا کہ لڑکھڑا رہی ہے اور پھر کہیں اگلی گاڑیوں کے پاس جا کر یا ان کے عقب میں اچانک ایک غضب ناک تڑ کی آواز کے ساتھ گر پڑی۔

بجلی کے کوندے شروع میں خوفناک دکھائی دیئے تھے لیکن جب بجلی کڑکنی شروع ہوئی تو یوں لگا کہ کوئی منحوس شے ہے جو ڈرا رہی ہے دہلا رہی ہے۔ اس کی روشنی سیدھی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی اور بدن میں ایک کپکپی پیدا کر رہی تھی۔ وہ کیا ترکیب

کرے کہ بجلی کے کوندے آگے دکھائی نہ دیں۔ ایگورشکا نے سوچا کہ اپنے چہرے کو الٹا کرلیا جائے چپکے سے جیسے اسے ڈر ہو کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے وہ اپنی ہتھیلیوں اور پنجوں کے بل جھک کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن گیلی گانٹھوں پر اس کی ہتھیلیاں پھسلنے لگیں۔ سو وہ اپنی پچھلی پوزیشن میں آ گیا۔

عین اس کے سر کے اوپر ترڑ ترڑ کا شور ہوا۔ بجلی تڑپتی ہوئی گاڑیوں کے نیچے تک گئی اور پھر ایک دم سے پھٹ پڑی۔

ایک مرتبہ پھر نادانستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اب اسے ایک نیا خطرہ نظر آیا۔ تین لمبے تڑنگے آدمی لمبے لمبے بلم سنبھالے گاڑیوں کے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک دفعہ جو بجلی کی چکا چوند ہوئی تو بلموں کی نوکیں جھلملا اٹھیں اور ان تین لمبے تڑنگے آدمیوں کا ڈیل ڈول بھی صاف دکھائی دے گیا۔ وہ تین چوڑے چکلے آدمی تھے۔ قد کاٹھ معمول سے زیادہ ہی تھا۔ چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ سر نیوڑھائے بھاری قدموں کے ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ ملول و مغموم دکھائی دیتے تھے کسی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید وہ کسی بری نیت سے گاڑیوں کا پیچھا نہیں کر رہے تھے مگر اس کے باوجود ان کے گاڑیوں کے آس پاس ہونے سے ایک ہیبت کا احساس ہوتا تھا۔

ایگورشکا نے جلدی سے پلٹ کر ساری جان سے کانپتے ہوئے صدا لگائی "پانتلی دادا!"

ترڑ ترڑ ترڑ ترڑ۔ یہ تھا اس کی صدا کا جواب جو آسمان کی طرف سے آیا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ گاڑی بان ہیں بھی یا نہیں۔ بجلی کے کوندے دو مقامات پر لپک رہے تھے جن سے سڑک دور تک جگمگا اٹھتی تھی۔ سڑک کے ساتھ گاڑیاں اور گاڑی بان بھی۔ سڑک پر یہاں سے وہاں تک پانی دھاروں دھار بہہ رہا تھا اور بلبلے ناچتے چل رہے تھے۔ پانتلی گاڑی کے برابر برابر یہ چل رہا تھا۔ اس کا لمبا ہیٹ اور کاندھا ایک چھوٹی سی چٹائی سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس کی چال ڈھال سے کسی خوف کا

اظہار ہو رہا تھا نہ کسی بیکلی کا۔ لگتا تھا کہ بجلی کی کڑک نے اسے بہرا اور چکا چوند نے اندھا کر دیا ہے۔

ایگور تشکا رو رو کر چلایا "دادا، جن۔"

مگر بوڑھے آدمی کو کچھ سنائی نہیں دیا۔ اس سے آگے ایمیلیان چل رہا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک چٹائی اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی کچھ مثلث کی سی شکل بنی ہوئی تھی۔ واسیا نے کچھ اوڑھا ہوا نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ ویسے ہی چل رہا تھا جیسے اس کے لکڑی کے قدم ہوں، گھٹنوں کو خم دیئے بغیر سیدھے سیدھے قدم اٹھاتا۔ بجلی کی چکا چوند میں یوں لگا جیسے گاڑیاں چل نہیں رہی ہیں اور گاڑی بان ساکت و جامد ہیں اور واسیا کا اٹھا ہوا ڈگ فضا میں معلق ہے۔

ایگور تشکا نے ایک مرتبہ پھر بوڑھے کو آواز دی۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اب اسے طوفان کے گزر جانے کا کوئی انتظار نہیں تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ بس ابھی اس پر بجلی گرے گی اور اسے جلا کر خاک کر دے گی، یہ کہ اتفاق سے وہ آنکھیں کھول کر دیکھے گا اور وہ ہیبت ناک جن اسے پھر دکھائی دیں گے۔ اب وہ سینہ پر صلیب کے نشان بنا رہا تھا، نہ بڈھے کو آواز دے رہا تھا نہ اپنی ماں کو یاد کر رہا تھا۔ بس سردی سے ٹھٹھرا بیٹھا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ یہ طوفان کبھی نہیں گزرے گا۔

لیکن آخر کے تئیں ایک آواز آئی "ایگوری، کیا سو گئے ہو؟" پانتلی نے نیچے سے آواز دی "نیچے اتر آؤ . . . . ارے ننھے کیا تو بہرا ہو گیا ہے؟"

"یہ تو بالکل طوفان تھا،" ایک اجنبی بھاری آواز ابھری اور اجنبی نے کھنکھار کر تھوڑا گلا صاف کیا ایسے جیسے اس نے ابھی ابھی دوا کا پورا گلاس حلق میں انڈیلا ہو۔

ایگور تشکا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ گاڑی کے بالکل برابر پانتلی کھڑا تھا اور مثلث کی شکل بنا ہوا ایمیلیان اور وہ جن۔ اب تو یہ جن کچھ چھوٹے نظر آرہے تھے اور جب

ایگور نشکا نے زیادہ غور سے اور ذرا قریب سے انہیں دیکھا تو وہ تو سیدھے سادھے کسان نکلے اور انہوں نے کاندھوں پر بلم بھالے نہیں بلکہ ہل اٹھائے ہوئے تھے۔ پانتی اور مثلث نما ایمبلیا کے درمیان جو جگہ چھوٹی ہوئی تھی وہاں ایک پستہ قد جھونپڑے کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ تو گویا گاڑیاں گاؤں میں آ کر پڑاؤ کر رہی تھیں۔ ایگور نشکا نے چٹائی اٹھا کر ایک طرف پھینکی، اپنی پوٹلی سنبھالی اور جھٹ پٹ نیچے اتر آیا۔ اب جب اسے اپنے آس پاس بولتے چالتے لوگ دکھائی دیئے، ایک روشنی والی کھڑکی نظر آئی تو اس کا سارا ڈر خوف رفو چکر ہو گیا حالانکہ بجلی اب بھی اسی طرح تڑتڑ رہی تھی اور پورا آسمان برقی لہر کی لپیٹ میں تھا۔

"اچھا خاصا طوفان تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"، پانتلی بڑبڑانے لگا "رب کا شکر ہے میرے پاؤں مینہ سے ذرا نرم پڑے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ خیر ٹھیک ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایگوری تم اتر آئے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا جھونپڑے میں اندر چلے جاؤ، سب ٹھیک ہے۔"

"مقدس باپ، مقدس، مقدس"، ایمبلیان ورد کئے جا رہا تھا "بجلی کہیں ضرور گری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"، پھر جنات سے مخاطب ہوا "تم لوگ اس علاقہ سے تعلق رکھتے ہو؟"

"نہیں جی۔ ہم تو گلینوف کے ہیں۔ گلینوف کے رہنے والے ہیں یہاں یلا تر نز پر کام کر رہے ہیں۔"

"اناج پھٹکنے کا کام؟"

"ہر طرح کا کام۔ ان دنوں گندم کی کٹائی پر لگے ہوئے ہیں۔ بجلی نے تو کمال کر دیا۔ بہت زمانے کے بعد ایسا طوفان دیکھا ہے۔"

ایگور نشکا جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔ وہاں اسے ایک نوکیلی ٹھوڑی والی دبلی کبڑی عورت ملی۔ وہ چربی سے جلتا ایک چراغ ہاتھوں میں لئے کھڑی تھی۔ آنکھیں مچکا مچکا کر دیکھ رہی تھی اور لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔

کہنے لگی "خداوند نے کیسا طوفان ہم پہ توڑا ہے" اور بے چارے ہمارے بچے رات کے
بیتپی میں گئے ہوئے ہیں۔ ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ بے چارے۔ اے ننھے میاں کپڑے اتار دو،
بھیگ گئے ہیں۔ اتار دو یہ کپڑے"
سردی سے تھر تھر کانپتے ہوئے اور بڑی نازک مزاجی سے کندھے سکوڑتے ہوئے
اس نے اپنا تر بتر اوور کوٹ اتارا۔ پھر اپنے بازوؤں کو پھیلایا اور ٹانگیں چھدری کر کے کھڑا
ہو گیا۔ دیر تک بالکل ساکت کھڑا رہا۔ ذرا سا بھی ہلتا تو سردی اور تری کا ایک عجیب
ناخوشگوار سا احساس ہوتا۔ اس کی قمیص کی پشت اور آستینیں پانی میں شرابور تھیں۔
پتلون کے پائنچے ٹانگوں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے اور سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔
"ننھے میاں اس طرح ٹانگیں چیر کر کھڑے ہونے کا کیا فائدہ ہے"، بوڑھیا کہنے لگی۔ "آؤ
یاں پہ آکے بیٹھ جاؤ۔"
ایگورشکا اسی طرح ٹانگوں کو چھدرا کئے ہوئے چلا اور چل کر میز کے پاس پہنچا اور
بنچ پر کسی کے سر کے برابر بیٹھ گیا۔ سر نے حرکت کی۔ نتھنوں سے ہوا زور سے کھینچی۔ پھر چوسنے
کی آواز پیدا ہوئی۔ پھر یہ آواز معدوم ہو گئی۔ جیسے مٹی کا تودہ ہو ایسی کوئی چیز بھیڑ کی
کھال میں لپٹی بنچ پہ سر سے لے کر آگے تک پھیلی پڑی تھی۔ یہ کوئی کسان عورت تھی
کہ سوئی پڑی تھی۔
بوڑھیا آہیں بھرتی باہر نکل گئی۔ پھر وہ ایک بڑا سا تربوز اور خربوزے کی ایک
چھوٹی سی بٹیا لے کر واپس آئی۔
"لو جانی کچھ تھوڑا بہت کھا لو۔ اس وقت میں اور کیا پیش کروں۔ یہی کچھ ہے۔ . . ."
جماہی لیتے ہوئے کہنے لگی۔ اس نے میز پہ پڑی چیزوں کو الٹا پلٹا اور ٹٹول کر ایک لمبا سا
تیز دھار والا چاقو نکالا، بالکل اس قسم کا چاقو جس سے ڈاکوؤں نے سرائے میں بیوپاری
کو ہلاک کیا تھا۔

ایگورشکا ایسے کپکپا رہا تھا جیسے اسے بخار چڑھا ہو۔ اسی عالم میں اس نے ڈبل روٹی سے خربوزے کی ایک قاش کھائی۔ پھر تربوز کی ایک پھانک کھائی۔ اس سے اور زیادہ سردی لگنے لگی۔

جب وہ کھا رہا تھا تو بوڑھیا نے پھر ایک آہ بھری کہنے لگی "ہمارے بچے بھیگ گئے ہوئے ہیں۔ ان کی رات وہیں گزرے گی۔" پھر بولی "یہ تو خداوند کا قہر ہے۔ میں شبیہ کے سائے تلے موم بتی جلا کے رکھ دوں لیکن مجھے پتہ نہیں کہ ستپندا نے اسے کہاں چھپا کے رکھ دیا ہے..... ارے اور کھاؤ نا۔ ننھے میاں اور کھاؤ....." بوڑھیا نے جماہی لی اور اپنے دائیں ہاتھ کو پیچھے لے جا کر بایاں کھوا کھجلانے لگی۔

"اب دو بج رہے ہوں گے۔" پھر کہنے لگی "بس سویرا ہونے کو ہے۔ ہمارے بچے بھیگ گئے ہوئے ہیں۔ غریب رات وہیں گزاریں گے۔ وہ سب کے سب پانی میں شرابور ہو گئے ہوں گے۔"

"نانی اماں،" ایگورشکا بولا "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"لیٹ جا میرے لال، لیٹ جا۔" بوڑھیا نے جماہی لیتے ہوئے پھر ایک آہ بھری "خداوند مسیح رحم کر۔ پس میں تو سوئی پڑی تھی۔ اسی نیند میں مجھے شور سنائی دیا جیسے کوئی دروازہ پیٹ رہا ہو۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا۔ ارے وہ تو خداوندی قہر تھا کہ ہم پہ ٹوٹ پڑا تھا..... میں نے سوچا کہ موم بتی جلا دوں مگر مجھے موم بتی ملی ہی نہیں۔"

بوڑھیا نے اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے بنچ سے کچھ چیتھڑے گودڑے گھسیٹے۔ شاید اس کا اپنا بستر تھا۔ پھر سٹوو کے برابر کھونٹی پر لٹکی ہوئی دو بھیڑ کی کھالیں اتاریں۔ ان سے اس نے ایگورشکا کے لئے بستر تیار کیا۔ "طوفان تھمنے میں نہیں آ رہا۔" بڑبڑانے لگی۔ "ہمارے بچے بھیگ گئے ہوئے ہیں۔ غریب رات وہیں گزاریں گے۔ میرے لال، لو لیٹ جاؤ اور سو جاؤ۔ خداوند مسیح کا تم پر سایہ ہو میرے لال، سو جاؤ..... میں خربوزہ

یاں سے نہیں اٹھاؤں گی۔ جب اٹھو گے تو شاید پھر تھوڑا بہت کھالو۔"

بوڑھیا کی آہیں اور جماہیاں، سوئی ہوئی عورت کا لگاتار تنفس، جھونپڑے کی نیم تاریک فضا، باہر سے آتا ہوا برستے مینہ کا شور، ان سب سے ایک غنودگی کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ ایگور تشکا کو بوڑھیا کے سامنے کپڑے اتارتے ہوئے تو شرم آ رہی تھی۔ سو اس نے بس اپنے بوٹ اتارے اور لیٹ گیا۔ اوپر سے بھیڑ کی کھالیں اوڑھ لیں۔

اس کے چند ہی منٹ بعد اسے پانتلی کی آواز سنائی دی جو سرگوشی میں کہہ رہا تھا "ننھے میاں سو گئے۔"

بوڑھیا نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا "ہاں ننھے میاں سو گئے۔ . . . یا کریم یا رحیم، رحم۔ گرجے چلا جا رہا ہے۔ آخر یہ طوفان کب تھمے گا۔"

"جلدی ہی تھم جائے گا۔" پانتلی نے بیٹھتے ہوئے دبی آواز میں کہا "کچھ دھیما تو پڑ گیا ہے۔ . . . چھوکرے اندر کوٹھریوں میں چلے گئے ہیں۔ دو ان میں سے گھوڑوں کے پاس ٹھہر گئے ہیں۔ . . . ضروری تھا۔ نہیں تو گھوڑوں کو چوری ہو جانا تھا۔ . . . اک ذرا بیٹھ لوں۔ پھر میں جا کر ڈیوٹی دوں گا۔ ضروری ہے۔ نہیں تو انہیں کوئی لے کر چمپت ہو جائے گا۔

پانتلی اور بوڑھیا دونوں ایگور تشکا کے پیروں میں برابر برابر بیٹھے تھے اور کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں کوئی لمبا ٹھنڈا سانس، کوئی جماہی۔ ادھر ایگور تشکا کو گرمائی نہیں آ رہی تھی۔ ویسے تو اس نے بھیڑ کی بھاری کھال اوپر لے رکھی تھی لیکن کپکپاہٹ کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اور ہاتھ پیر اکڑے جا رہے تھے۔ اس نے کھال کے اندر ہی اندر اپنے کپڑے اتار دیئے مگر اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسے اور زیادہ جاڑا لگنے لگا تھا۔ اور زیادہ۔

پانتلی اپنی باری بھگتنے کے لئے چلا گیا۔ باری بھگتائی اور واپس بھی آ گیا مگر ایگور تشکا

ابھی تک نہیں سو پایا تھا۔ اس پہ تو سر سے پیر تک کپکپی طاری تھی۔ سر اور بدن پر ایک بوجھ سا تھا، ایک گھٹن کا احساس۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس وجہ سے ہے۔ بڈھے بوڑھیا کی کھسر پھسر کی وجہ سے ہے یا بھیڑ کی کھال سے جو بساند اُٹھ رہی ہے اس کی وجہ سے ہے۔ خربوزہ تربوزہ کھا کر بھی اس کا جی خراب ہی ہوا تھا۔ ان پھانکوں نے اس کی زبان پر ایسا ذائقہ چھوڑا جیسے کوئی کسیلی چیز کھالی ہو۔ اوپر سے کھٹمل اسے کاٹ رہے تھے۔

"دادا، مجھے جاڑا لگ رہا ہے۔" اس نے ایسے کہا کہ خود اسے اپنی آواز پہچاننے میں نہیں آئی۔

"سو جاؤ، بچو سو جاؤ۔" بوڑھیا نے پھر ایک آہ بھری۔

تیلی تیلی ٹانگوں والا ٹڈا اس کے بستر کے پاس آیا۔ لمبا ہونے لگا۔ لمبا ہوتے ہوتے چھت سے جا لگا اور پون چکی بن گیا اور اپنے بازو گھمانے لگا........ پھر کرسٹفر پادری آئے۔ اس شکل میں نہیں جس شکل میں وہ ٹم ٹم میں نظر آرہے تھے یہاں تو انہوں نے اپنی پادریوں والی پوشاک پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں گلاب پاش تھا۔ پون چکی کے گرد چکر کاٹا۔ گلاب پاش سے متبرک پانی چھڑکا اور پون چکی اپنے بازو گھماتی غائب ہوگئی۔ ایگورشکا سمجھ گیا کہ یہ محض ہذیان ہے اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

"دادا"، اس نے آواز دی "مجھے پانی پلا دو۔"

جواب ندارد۔ ایگورشکا کو سخت گھٹن محسوس ہو رہی تھی اور لیٹے ہوئے بہت بے آرام ہو رہا تھا۔ اُٹھ بیٹھا۔ کپڑے پہنے اور باہر نکل گیا۔ تڑکا ہو چلا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ لیکن مینہ اب نہیں برس رہا تھا۔ کپکپاتے ہوئے وہ اپنے بھیگے کوٹ میں خوب اچھی طرح دبک گیا اور پھر اس نے کیچڑ بھرے احاطہ کا چکر لگایا اور خاموشی کی آواز کو سنا۔ اسے ایک چھوٹا سا سائبان دکھائی پڑا جس کے ادھ کھلے

دروازے پر پھونس کی اک چٹائی پڑی تھی۔ اس نے سائبان کے اندر جھانک کر دیکھا، پھر اندر چلا گیا، اور ایک تاریک گوشے میں جاکر وہاں ایک ڈنڈے پہ ٹک گیا۔

اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ ذہن میں خیالات گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ منہ خشک ہو گیا تھا اور کسیلے ذائقہ سے بدمزگی کی سی کیفیت تھی۔ اس نے غور سے اپنے ہیٹ کو دیکھا، مور کے پر کو سیدھا کیا اور پھر اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ ماں کے ساتھ بازار گیا تھا اور یہ ہیٹ خریدا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بھوری بھوری چپچپاتی ہوئی لیئی جیسی کوئی چیز اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے اسے نکال کر دیکھا اور حیران ہوا کہ اس کی جیب میں یہ چیز کہاں سے آئی۔ تھوڑا سوچا، سونگھا۔ اس میں شہد کی مہک تھی۔ اچھا اچھا، یہ تو وہ کیک ہے جو یہودن نے اسے دیا تھا کتنا سیل گیا تھا۔

ایگورُشکا نے اپنے کوٹ کا جائزہ لیا۔ یہ ذرا چھوٹے سائز کا دھوے رنگ کا اوورکوٹ تھا کہ فراک کوٹ کی طرز پر تراشا گیا تھا اور جس پر بڑے بڑے ہڈی کے بٹن ٹنکے ہوئے تھے چونکہ یہ نیا اور قیمتی مال تھا اس لئے گھر میں وہ ہال کمرے میں نہیں ٹانگا جاتا تھا بلکہ اماں کے کمرے میں ان کے کپڑوں کے ساتھ آویزاں کیا جاتا تھا۔ صرف تیج تیوہار کے موقعوں پر اسے پہننے کی اجازت تھی۔ کوٹ کو دیکھ کر ایگورُشکا کا دل بہت دکھا۔ سوچنے لگا کہ اب تو وہ اور اوورکوٹ دونوں ہی تقدیر کے رحم وکرم پر ہیں۔ سوچنے لگا کہ اب وہ کبھی گھر واپس نہیں جا سکے گا اور سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ اس شدت سے رویا کہ گوبر کے ڈھیر پہ گر پڑا۔

ایک بڑا سا سفید کتا پانی میں شرابور سائبان میں گھس آیا۔ اس کے منہ پہ تڑے مڑے کاغذ کی طرح کے نرم گچھے بنے ہوئے تھے وہ بہت تجسس سے ایگورُشکا کو تکنے لگا۔ لگتا تھا کہ تذبذب میں ہے کہ بھونکا جائے یا نہ بھونکا جائے آخر اس نے طے کیا کہ بھونکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ طے کر لینے کے بعد وہ چپکے چپکے ایگورُشکا کے پاس آیا۔ اس چپچپاتی لیئی کو چاٹا اور چاٹ کر باہر نکل گیا۔

"ورلموف کے آدمی آ گئے ہیں"، کسی نے گلی میں چلا کر کہا۔

ایگور شکا رد کر ملا کا ہو گیا تھا۔ سائبان سے نکلا اور پانی کے اک گڑھے کے گرد چکر کاٹ کر گلی کی طرف چلا۔ گاڑیاں پھاٹک کے عین سامنے کھڑی تھیں۔ گاڑی بان جن کے کپڑے بارش سے بھیگ چکے تھے اور پیر کیچڑ میں لت پت تھے گاڑیوں کے آس پاس گھوم پھر رہے تھے یا گاڑی کی چھڑوں پر ایسے مرے سے بیٹھے تھے جیسے جاڑوں میں مکھیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ ایگور شکا انہیں دیکھ کر سوچنے لگا کہ کسان ہونا بھی کتنی پریشانی کا سودا ہے وہ پانتلی کے پاس جا کر اس کے قریب ہی چھڑ پر بیٹھ گیا۔ اسے ایک کپکپی آئی۔ اپنے ہاتھ اس نے آستینوں میں کھسا لئے اور بولا "دادا، مجھے جاڑا لگ رہا ہے"۔

"فکر مت کرو۔ ہم جلدی ٹھکانے پہ پہنچیں گے"۔ پانتلی نے جماہی لی اور پھر بولا "فکر مت کرو۔ گرمائی آ جائے گی"۔

جب گاڑیاں چلی ہیں تو شاید ابھی بہت سویرا تھا اس لئے کہ گرمی بالکل نہیں تھی۔ ایگور شکا اون کی گانٹھوں پر جا لیٹا اور جاڑے سے کانپنے لگا حالانکہ جلدی ہی سورج نکل آیا تھا اور اس کے کپڑے، اون کی گانٹھیں، اور زمین سب خشک ہو گئے تھے۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں موندیں ویسے ہی ٹِٹ اور پون چکی پھر اسے دکھائی دینے لگے طبیعت کچھ بھاری کچھ گری گری سی محسوس ہوئی۔ اسی کیفیت میں اس نے اس تصوّر کو دفع کرنے کی اپنی سی بہت کوشش کی لیکن یہ تصور دفع ہوا تو ایک اور تصویر تصوّر میں ابھری کہ شیطان وائیموف اپنی سرخ انگارہ آنکھوں اور تنے ہوئے مکے کے ساتھ دہاڑتا چنگھاڑتا اس پر لپکا ہے یا پھر اس کی وہی صدا کانوں میں آنے لگتی "میں مکروہ آدمی ہوں"۔ پھر جیسے ورلموف اپنے پستہ قد گھوڑے پہ ٹخ ٹخ کرتا جا رہا ہے۔ کانستنتن اپنے آپ میں مگن ہنستا مسکراتا بغل میں قاز کو دابے چلا جا رہا ہے اور ان لوگوں کو دیکھ کر کتنی بیزاری کتنی کوفت ہوتی تھی۔

اس وقت شام ہو چلی تھی ۔ کہ ایک دفعہ اس نے پانی مانگنے کی نیت سے سر اُٹھایا۔ اس وقت گاڑیاں ایک بڑے سے پل پر رکی کھڑی تھیں۔ نیچے دریا کا چوڑا پاٹ تھا۔ دریا پہ کالا کالا دھواں سا منڈلا رہا تھا۔ اس دھوئیں کے اس پار ایک سٹیمر نظر آ رہا تھا اس کے ساتھ رسی سے بندھی ایک مال بردار ناؤ چل رہی تھی۔ ان سے آگے دریا کے اس پار ایک بڑا سا پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جس پہ جا بجا مکان اور گرجا گھر نظر آ رہے تھے۔ پہاڑ کی تلی میں ایک مال گاڑی کے برابر برابر ایک انجن شنٹنگ کر رہا تھا۔

ایگورشکا نے اس سے پہلے کبھی نہ سٹیمر دیکھے تھے نہ انجن دیکھے تھے اور نہ کوئی چوڑے پاٹ والا دریا دیکھا تھا لیکن اس وقت ان چیزوں کو دیکھ کر نہ وہ پریشان ہوا نہ حیران ہوا اور نہ تجسس قسم کی کوئی کیفیت اس کے چہرے پر نمایاں ہوئی۔ بس اسے بیزاری سی ہوئی۔ جلدی سے اس نے اون کے گٹھر پہ پڑے پڑے کروٹ لے لی۔ وہ بیمار ہو گیا تھا۔ پانتلی نے یہ دیکھ کر کھنکار کر گلا صاف کیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا " ہمارے ننھے میاں بیمار ہو گئے۔ شاید پیٹ میں ٹھنڈ لگ گئی۔ ننھے میاں۔ . . . گھر سے دور . . . یہ تو بری بات ہوئی "

(۸)

گاڑیاں بیوپاریوں کی ایک بڑی سرائے میں جا کر ٹھہریں جو گھاٹ سے ایسی دور نہیں تھی۔ ایگورشکا جب گاڑی سے نیچے اترا تو اسے ایک مانوس آواز سنائی دی۔ کوئی اسے سہارا دے کر نیچے اتار رہا تھا اور کہہ رہا تھا "ہم کل شام آ گئے تھے۔ کل سارے دن تمہارا انتظار دیکھتے رہے۔ ہمارا ارادہ تو کل تم سے آ ملنے کا تھا لیکن تم ہمارے رستے میں نہیں پڑتے تھے۔ ہم دوسری سڑک سے آئے ہیں۔ ارے تمہارا کوٹ کتنا مل دل گیا ہے۔ تمہارے ماموں آکر تمہاری خبر لیں گے"۔
جو شخص اس سے باتیں کر رہا تھا اس کے چہرے کو اس نے غور سے دیکھا اور پہچانا کہ ارے یہ تو دنیسکی ہے۔
دنیسکی کہنے لگا "تمہارے ماموں جان اور پادری کرسٹفر اپنے کمروں میں ہیں۔ چائے پی رہے ہیں۔ آؤ چلو"۔
وہ ایگورشکا کو ایک بڑی سی دو منزلہ عمارت میں لے گیا۔ اس میں اندھیرا تھا اور گھٹی گھٹی سی فضا تھی۔ ایسی میں خیراتی اداروں کی جو فضا ہوتی ہے کچھ اس سے ملتی جلتی۔ وہ ڈیوڑھی سے ہوتے ہوئے ایک اندھیرے زینے سے اور پھر ایک پتلی لمبی گیلری سے گزرے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے جہاں واقعی ایواں ایوانچ اور پادری کرسٹفر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دونوں بوڑھے لڑکے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حیران بھی۔
پادری کرسٹفر خوش ہو کر بولے "ایگور نکولائیچ بسٹر لومنوسوف"۔

کرمتسوف نے کہا "جنٹلمین، تمہیں دیکھ کر جی خوش ہوا۔"

"تمہیں سفر اچھا لگا؟" پادری کرسٹفر نے اس پر سوالوں کی بوچھار کر ڈالی۔ اس کے لئے چائے بناتے جاتے تھے اور ایک کھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتے جاتے تھے "مجھے یقین ہے کہ تم بیزار ہو گئے ہو گے۔ اللہ معافی دے، چلے جا رہے ہیں۔ چلے جا رہے ہیں آگے جتنا دیکھو سٹیپی اسی طرح پھیلا نظر آئے گا۔ کہیں جا کر ختم ہی نہیں ہوتا۔ یہ سفر تھوڑا ہی ہے بس ایک مستقل اذیت ہوتی ہے۔ میاں چائے کیوں نہیں پی رہے۔ پی ڈالو۔ اور دیکھو ادھر تو تم گاڑیوں کے ساتھ کھنچے کھنچے پھر رہے تھے ادھر ہم نے اپنے سارے سودے بڑی کامیابی سے کر ڈالے خداوند کا شکر ہے کہ ہم نے ثریا بہن کے ہاتھ فروخت کیا۔ سودا حسب خواہش ہو گیا۔ اس سے زیادہ کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ . . . . ہم نے بہت اچھا سودا کیا ہے۔"

اپنے لوگوں کو دیکھ کر سب سے پہلا خیال ایگورشکا کو یہ آیا کہ ان سے شکوہ شکایت کی جائے۔ پادری کرسٹفر کی باتیں وہ کہاں سن رہا تھا۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کی جائے اور شکایت کیا کی جائے۔ مگر پادری کرسٹفر کی آواز نے کہ اسے بہت ناخوشگوار معلوم ہو رہی تھی اسے یکسوئی سے سوچنے ہی نہیں دیا۔ الٹا اسے گڑبڑا دیا۔ مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ وہ میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور جا کر صوفے پر لیٹ گیا۔

"ارے" پادری کرسٹفر حیران ہو کر کہنے لگے "تم نے چائے تو پی ہی نہیں۔"

ایگورشکا ابھی تک اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اسے کیا شکایت کرنی چاہیئے۔ اسی عالم میں اس نے دیوار کی طرف کروٹ لی اور سسکیوں سے رونا شروع کر دیا۔

"ارے ارے" پادری کرسٹفر نے بھی پھر وہی الفاظ دہرائے۔ اٹھ کر صوفے کے پاس گئے "ایگوری۔ کیا ہوا۔ کیوں رو رہے ہو۔"

"میں . . . . میں . . . . میں بیمار ہوں۔" ایگورشکا نے کس مشکل سے یہ لفظ کہے۔

"بیمار" پادری کرسٹفر حیران ہو کر بولے "یہ تو بری بات ہے۔ آدمی کو سفر میں بیمار

نہیں پڑنا چاہیئے صاحبزادے، کیا سوچ رہے ہو تم؟"

پادری صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، اس کے گالوں کو چھوا اور کہا "ہاں ہنہیں تو حرارت ہے تمہیں ٹھنڈ لگی ہے یا کوئی غلط چیز کھالی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خداوند سے دعا کرو"۔

الوان الیوچ پریشان ہو کر بولے "اسے کونین نہ کھلادیں؟"

"نہیں۔ اسے کوئی گرم غذا ملنی چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایگوری تم تھوڑا سا شوربہ پی لو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں نا؟"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں لوں گا۔"

"تمہیں جاڑا تو نہیں لگ رہا؟"

"جاڑا پہلے لگ رہا تھا۔ اب نہیں۔ اب تو میں پھنک رہا ہوں اور سارے بدن میں درد ہو رہا ہے۔"

الوان الیوچ نے صوفے کے پاس جا کر ایگورشکا کے سر کو چھو کر دیکھا۔ ایک گھبراہٹ کے ساتھ کھنکھار کر گلا صاف کیا اور واپس میز پہ جا بیٹھا۔

"میں بتاتا ہوں تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ کپڑے اتارو اور بستر میں جا کر آرام کرو۔" پادری کرسٹفر کہنے لگے "تمہیں بس اب سو جانا چاہیئے۔"

انہوں نے ایگورشکا کے کپڑے اتروائے۔ سرہانے تکیہ رکھا۔ لحاف اڑھا دیا۔ اوپر سے الوان الیوچ کا اوورکوٹ ڈال دیا۔ پھر دبے پاؤں واپس ہوئے اور میز پہ جا بیٹھے۔ ایگورشکا نے آنکھیں موندلیں اور بس فوراً اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ کمرے میں نہیں ہے بلکہ سڑک پر الاؤ کے کنارے بیٹھا ہے اور ایمیلیا اپنے بازوؤں کو گھما رہا ہے اور دائیموف لال انگارہ آنکھیں نکالے پیٹ کے بل لیٹا ہے اور بڑی حقارت سے اسے دیکھ رہا ہے۔

"اسے مارو۔ اسے مارو"، ایگورشکا نے چلانا شروع کر دیا۔

"اس پہ ہذیانی کیفیت طاری ہے،" پادری کرسٹفر نے دبی آواز میں کہا۔

"عجب مصیبت ہے۔" الیوان الیوچ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اس کے سر پر تیل اور سرکہ ملنا چاہیئے۔ خداوند نے چاہا تو کل تک افاقہ ہو جائے گا۔"

ایگورشکا کا جو تصوّر بندھ گیا تھا اسے اس نے الگ جھٹکتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور آگ کو تکنے لگا۔ پادری کرسٹفر اور الیوان الیوچ اپنی اپنی چائے ختم کر چکے تھے اور سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ پادری صاحب مسکرائے جا رہے تھے۔ اون کی اچھی قیمت لگنے پر ابھی تک ان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ منافع کے خیال سے زیادہ وہ یہ تصوّر کر کے خوش ہو رہے تھے کہ وہ واپس جا کر خاندان بھر کو جمع کر کے بیچ میں بیٹھیں گے، ان سے ہنسیں بولیں گے۔ اشارے کنائے کریں گے، پہلے یہ جتائیں گے کہ اون کی قیمت بہت کم لگی ہے، پھر کاغذات کا ایک موٹا سا بنڈل اپنے داماد مائیکل کے حوالے کریں گے اور کہیں گے کہ یہ لو۔ سودا اس طرح کیا کرتے ہیں۔ مگر کزمشوف مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے وہی پہلی سی پریشانی ٹپک رہی تھی جو کاروباری لوگوں کے چہرے سے ٹپکا کرتی ہے۔

"اگر مجھے پتہ ہوتا کہ چرپاہن اتنی قیمت لگائے گا،" وہ آہستہ سے بولا "تو میں نے جو وہاں گھر میں رکھی پانچ گانٹھیں مکھروف کے ہاتھ فروخت کر دیں کبھی فروخت نہ کرتا۔ بڑی پریشانی پیدا ہو گئی۔ مگر وہاں کس کو اندازہ تھا کہ یہاں قیمتیں اتنی چڑھ گئی ہیں۔"

سفید قمیص میں ملبوس ایک شخص نے آ کر وہاں سے سموار اٹھائی اور کونے میں شبیہ کے سامنے رکھے ہوئے چھوٹے سے چراغ کو روشن کیا۔ پادری کرسٹفر نے چپکے سے اس کے کان میں کچھ کہا، اور جواب میں اس شخص نے اس انداز سے دیکھا اور ایسے منہ بنایا جیسے کوئی بہت دانہ کی بات ہو اور وہ جتا رہا ہو کہ مجھے سب پتہ ہے۔ وہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور کوئی چیز صوفے کے نیچے رکھ دی الیوان الیوچ نے نیچے فرش پر اپنا بستر بچھایا، لمبی لمبی جماہیاں لیں، بے دلی سے دعا پڑھی اور لیٹ گیا۔

پادری کرسٹفر کہنے لگے "میں کل کیتھڈرل جانے کی سوچ رہا ہوں۔ وہاں ایک محافظ صاحب

ہیں جن سے میری شناسائی ہے تو خیال یہ ہے کہ وہاں جاکر ماس میں شرکت کی جائے اور اس کے بعد بشپ صاحب سے نیاز حاصل کیا جائے، لیکن سنا ہے کہ وہ علیل ہیں۔"

پادری صاحب نے جماہی لی اور لیمپ بجھا دیا۔ اب کمرے میں اندھیرا تھا۔ یسوع کی شبیہ کے سامنے رکھا دیا ٹمٹما رہا تھا۔

"سنا ہے کہ وہ آجکل کسی آنے والے کو شرف ملاقات نہیں بخشتے۔" پادری کرسٹفر تبدیلی لباس کرتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ "تو ان کا دیدار کئے بغیر ہی لوٹنا پڑے گا۔"

انہوں نے اپنا اوور کوٹ اتارا۔ اور ایگورشکا کو یوں لگا کہ اس کے سامنے رابنسن کروسو آن کھڑا ہوا ہے۔ رابنسن نے طشتری میں کوئی چیز ہلائی جھلائی۔ ایگورشکا کے پاس گیا اور چپکے سے کہا۔ "ایگورشکا۔ کیا سو گئے؟ ذرا اٹھ کر بیٹھو۔ میں تمہارے تیل اور سرکہ کی مالش کروں گا۔ یہ مفید چیز ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ ساتھ میں تم خداوند کو بھی یاد کرو۔"

ایگورشکا نے جلدی سے جھرجھری لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پادری کرسٹفر نے ایگورشکا کی قمیص اتاری اور کچھ اس انداز سے سکڑتے ہوئے اور رک رک سانس لیتے ہوئے جیسے ان کے گلگلی کی جا رہی ہے انہوں نے اس کے سینے پر مالش شروع کر دی۔

"باپ بیٹے اور روح القدس کا واسطہ۔" وہ آہستہ سے بولے "اب ذرا پیٹ لیٹ جاؤ۔ ہاں اس طرح۔۔۔۔۔ کل تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مگر پھر ایسا مت کرنا۔ تمہارا بدن تو پھنک رہا ہو۔ میرا خیال ہے کہ جب طوفان آیا ہے تو تم رستے میں تھے۔"

"جی"

"پھر بیمار تو پڑنا ہی تھا۔ باپ بیٹے اور روح القدس کا واسطہ۔۔۔۔۔ بیمار تو پھر۔۔۔"

پادری کرسٹفر جب مالش کر چکے تو انہوں نے اسے پھر قمیص پہنا دی۔ کپڑا اڑھایا، صلیب کا نشان اس پر بنایا اور وہاں سے اٹھ گئے۔ پھر ایگورشکا نے دیکھا کہ پادری صاحب دعا پڑھ رہے ہیں۔ شاید اس بزرگ کو بہت سی دعائیں حفظ تھیں۔ جب ہی تو وہ کتنی

دیر تک شبیہ کے سامنے کھڑے ورد کرتے رہے۔ دعائیں پڑھنے کے بعد انہوں نے دریچے دروازے اور اگور شکا کی طرف باری باری رخ کر کے صلیب کا نشان بنایا۔

اور الیوان الیونچ اس چھوٹے سے صوفے پر تکئے کے بغیر لیٹ گیا۔ اوپر سے اوورکوٹ لے لیا۔ برآمدے میں لگی گھڑی نے ٹن ٹن دس بجائے۔ اگور شکا سوچنے لگا کہ کتنی دیر میں صبح ہو گی۔ وہ تکلیف میں تھا۔ اسی تکلیف میں اس نے اپنا ننھا صوفے میں دھنسا دیا۔ اب اس نے اوٹ پٹانگ خوابوں سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دی تھی مگر صبح اس کی توقع کے خلاف جلدی ہی ہو گئی۔

اسے لگا کہ صوفے کی پشت میں اس کا سر ایسی زیادہ دیر تک دھنسا نہیں رہا تھا لیکن جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس ہوٹل کے کمرے کے دو دریچوں سے ترچھی کرنیں چھن چھن کر فرش پر پڑ رہی تھیں۔ پادری کرسٹفر اور الیوان الیونچ دونوں کمرے میں نہیں تھے۔ کمرے کی صفائی ہو چکی تھی۔ چم چم چمک رہا تھا۔ سکون کی فضا تھی اور پادری کرسٹفر کی باس فضا میں بسی ہوئی تھی۔ پادری صاحب کے کپڑوں سے ہمیشہ جنگلی پھولوں اور سرو و صنوبر کی باس آتی رہتی تھی۔ گھر میں ہوتے ہوئے وہ ہمیشہ جنگلی پھولوں سے شبیہوں کے لئے آرائشی ہار بناتے رہتے تھے اور گلاب پاشس تیار کرتے رہتے تھے۔ سو اس لئے وہ ان خوشبوؤں میں بسے رہتے تھے۔ اگور شکا نے تکئے کو دیکھا، ترچھی شعاعوں کو دیکھا۔ اپنے بوٹوں کو دیکھا جنہیں صاف کر کے صوفے کے برابر میں رکھ دیا گیا تھا۔ اور وہ ہنسا۔ اسے یہ بات عجیب سی نظر آئی کہ وہ اب اون کی گانٹھوں پہ لیٹا ہوا نہیں تھا اور اس کے ارد گرد ہر چیز خشک تھی اور یہ کہ چھت پر بجلی نہ کڑک رہی تھی نہ چمک رہی تھی۔

اس نے صوفے سے چھلانگ لگائی اور تیار ہونے لگا۔ طبیعت بحال تھی۔ کل والی بیماری کے اب بالکل آثار نہیں تھے۔ بس ذرا گردن اور ٹانگوں میں ہلکی سی تھکن کی کیفیت تھی۔ گویا سرکہ اور تیل نے فائدہ پہنچایا تھا۔ اب اسے وہ چیزیں یاد آئیں جن کی ایک اڑتی اڑتی سی

جھلک کل اس نے دیکھی تھی۔ سٹیمر کی، ریل کے انجن کی، دریا کے پاٹ کی۔ اب اس نے بیک جھپک تیار ہونا شروع کیا کہ دوڑ کر گھاٹ پہ جائے اور ان چیزوں کو نظر بھر کر دیکھے۔ جب وہ نہا دھو کر اپنی سرخ قمیص پہن رہا تھا تو دروازے کی چٹخنی کھلی اور پادری کرسٹفر اس شان سے داخل ہوئے کہ سر پہ ٹاپ ہیٹ، بر میں کینوس کا کوٹ، اس کے اوپر بھورے رنگ کی ریشمیں کاسک، ہاتھ میں عصا، چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی (بوڑھے لوگ جب گرجا گھر سے لوٹ کر آتے ہیں تو ہمیشہ ان کا چہرہ خوشی سے دمکتا دکھائی دیتا ہے) انہوں نے توشے کی روٹی کا ایک ٹکڑا اور کسی چیز کا پیکیٹ میز پر رکھا، شبیہ کے سامنے کھڑے ہو کر دعا پڑھی اور کہنے لگے "خداوند نے ہم پہ اپنا کرم کیا ہے۔ اچھا تم کیسے ہو؟"

"ابو بالکل اچھا ہوں"، ایگورتسکا نے ان کے دست مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"خداوند کا شکر ہے...... میں ماس میں ہو کر چلا آیا...... میں گرجا گھر کے محافظ صاحب سے جن سے اپنی یاد اللہ ہے ملنے چلا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے ناشتہ پر مدعو کر لیا۔ مگر میں گیا نہیں۔ لوگوں سے صبح سویرے کی ملاقات مجھے پسند نہیں۔"

" پادری صاحب نے اپنی کاسک اتاری، سینہ کو ٹھونکا اور بہت اطمینان کے ساتھ پارسل کھولا۔ جب پارسل کھلا تو ایگورتسکا نے دیکھا کہ کیویر کا ایک ٹین ہے۔ تھوڑی سی خشک مچھلی ہے اور کچھ فرنچ رول ہیں۔

کرسٹفر پادری کہنے لگے "ایک مچھلی کی دوکان سے گزر ہوا تو میں نے یہ خریداری کر لی آدمی روز تو تر نوالہ نہیں کھا سکتا۔ لیکن میں نے سوچا کہ گھر میں ایک اپاہج فرد بیٹھا ہے۔ اس لئے یہ فضول خرچی قابل معافی ہے اور کیویر خوب ہے۔ مچھلی بھی ٹھیک ہے۔

سفید قمیص والا آدمی سموار اور ایک ٹرے کے ساتھ جس میں چائے کا سامان رکھا تھا داخل ہوا۔

پادری کرسٹفر نے ڈبل روٹی کے ایک سلائس پہ کیویر کو پھیلایا اور انگور شکا کو دیتے ہوئے کہا "لو تھوڑا سا کھا لو۔ کھاؤ اور مزے اڑاؤ۔ مگر تمہاری پڑھائی کا وقت بس جلدی آنے والا ہے۔ دیکھو دھیان سے اور دل لگا کے پڑھنا تاکہ اس کا کوئی نتیجہ بھی نکلے۔ جو حفظ کرنے کی چیز ہو اسے حفظ کرنا لیکن جب تمہیں ظاہری الفاظ کو ملحوظ رکھے بغیر اپنے لفظوں میں مفہوم بیان کرنا ہو تو پھر تم مفہوم اپنے لفظوں میں بیان کرنا۔ اور کوشش یہ کرنا کہ تمہیں ہر مضمون میں قدرت حاصل ہو۔ ایک شخص ریاضی میں تو پیرا ہوا ہے مگر غریب نے پطرس راہب کا نام بھی کبھی نہیں سنا۔ دوسرا پطرس راہب کے متعلق تو بہت کچھ جانتا ہے مگر چاند کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا۔ تمہارا مطالعہ اس طرح کا ہونا چاہیئے کہ تمہیں ہر مضمون میں درک حاصل ہو۔ لاطینی، فرانسیسی، جرمن اور ہاں جغرافیہ تاریخ، دینیات، فلسفہ، ریاضی یہ سارے مضمون پڑھنا اور جب تم ان سارے مضمونوں میں طاق ہو جاؤ۔ رٹ کر نہیں بلکہ عبادت سمجھ کر اور پورے انہماک کے ساتھ تو پھر تم ملازمت کرنا۔ اگر تم ہر مضمون سے شناسائی رکھتے ہو تو پھر زندگی کے ہر شعبہ میں تمہارے لئے آسانی ہی آسانی ہو گی۔ پڑھو اور خداوند کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور خداوند تمہیں ہدایت دے گا کہ تمہیں کیا بننا چاہیئے۔ ڈاکٹر، جج یا انجنیئر"

پادری کرسٹفر نے ڈبل روٹی کے ایک سلائس پر کیویر کو پھیلایا اور منہ میں رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"پال حواری کا ارشاد ہے کہ بھانت بھانت کے اول پٹال علوم میں سر مت کھپاؤ۔ کالا جادو، روحوں کو بلانے کا چکر، کوئی بھی ایسا علم جس کا نہ تمہیں فائدہ ہو نہ دوسروں کو، تو ایسے علم سے تو اجتناب ہی کرنا چاہیئے۔ تمہیں صرف اس علم کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے جسے خداوند نے جائز قرار دیا ہے مثال کے طور پر مقدس حواریین ہیں جنہوں نے سب زبانوں میں وعظ دیئے

ہیں۔ پس ہمیں زبانوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یا سل اعظم نے ریاضی اور فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ پس ہمیں ریاضی اور فلسفہ پڑھنا چاہیئے۔ سینٹ نیسٹر نے تاریخ لکھی۔ پس ہمیں تاریخ پڑھنی چاہیئے اور لکھنی چاہیئے۔ ہمیں اولیا کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔"

پادری کرسٹفر نے طشتری سے چائے پی۔ اپنی مونچھ کو رومال سے پونچھا اور سر کو جنبش دی۔

کہنے لگے "اچھی بات ہے۔ میری تعلیم تو پرانے طریقہ سے ہوئی تھی۔ اس عمر کے آتے آتے میں بہت کچھ بھول چکا ہوں لیکن اب بھی میرا زندگی کرنے کا طور باقی لوگوں سے مختلف ہے۔ میں مقابلہ نہیں کر رہا۔ مثلاً کھانے پر لوگ جمع ہوں یا کوئی محفل ہو اور وہاں کوئی لاطینی میں کوئی بات کہے یا تاریخ یا فلسفہ سے کوئی حوالہ دے تو اس سے جہاں دوسرے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں بھی لطف اندوز ہوتا ہوں۔۔۔۔ یا جب ضلع کے منصف صاحب آتے ہیں اور حلف لیتے ہیں۔ باقی پادری تو بہت جھجک محسوس کرتے ہیں مگر میں منصفوں سے بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ اسی طرح پراسیکیوٹروں اور وکیلوں کے ساتھ بھی بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ میں ان سے علمی گفتگو کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ چائے پیتا ہوں، ہنسی دل لگی کرتا ہوں۔ جو بات مجھے معلوم نہیں ہوتی۔ ان سے پوچھ لیتا ہوں۔۔۔۔۔ اور وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں۔ تو میرے بچے بات یوں ہے۔ علم نور ہے اور جہالت ظلمت ہے۔ تو علم حاصل کر۔ دبے شک یہ مشکل کام ہے اور آج کل تو پڑھائی مہنگی بہت ہو گئی ہے۔ تمہاری ماں بیوہ ہے۔ پنشن پہ اس کا گزارہ ہے لیکن۔۔۔۔" پادری کرسٹفر نے اندیشہ بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولے "ایوان ایونچ تمہاری مدد کریں گے وہ تمہیں بے آسرا نہیں چھوڑیں گے۔ ان کی اپنی اولاد تو ہے نہیں۔ وہ تمہاری مدد کریں گے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

پادری صاحب بہت سنجیدہ نظر آرہے تھے۔اب ان کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ آہستہ ہو گیا۔آہستگی اور نرمی سے کہنے لگے" ایگوری بس یہ یاد رکھو کہ ماں اور ایوان ایوچ کو نہیں بھولنا ہے۔خداوند تمہیں اس بری بات سے بچائے رکھے۔احکامات خداوندی میں بھی یہی تاکید کی گئی ہے کہ ماں کی عزت کرو۔اور ایوان ایوچ تمہارے سرپرست ہیں اور تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔خداوند وہ وقت نہ لائے کہ عالم فاضل بننے کے بعد تم لوگوں سے اس وجہ سے بدکنے لگو اور حقارت سے دیکھنے لگو کہ تمہاری طرح عقلمند نہیں ہیں ایگوری اگر تمہیں یہ کرنا ہے تو پھر تم پر افسوس ہے۔بہت افسوس"۔پادری کرسٹفر نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اپنی باریک آواز میں پھر وہی کلمہ دہرایا" تم پر افسوس ہے۔افسوس ہے تم پر"

پادری کرسٹفر کی زبان کھل گئی تھی یوں کہئے کہ اس موضوع پر رواں تھے۔لگتا تھا کہ رات کے کھانے کے وقت تک اسی طرح جاری رہیں گے۔مگر ہوا یہ کہ ایک ساتھ دروازہ کھلا اور ایواں ایوچ داخل ہوئے۔ایک عجلت میں سلام کر کے میز پہ آن بیٹھے اور جلدی جلدی چائے پینے لگے۔

کہنے لگے" اچھا تو میں نے تو اپنے کاروبار کے سارے معاملات نپٹا ڈالے۔آج ہم گھر کے لئے چل پڑتے لیکن ایگوری کے متعلق تو ابھی سوچنا ہے۔ہمیں بہرحال اس کے لئے کوئی بندوبست کرنا ہے۔میری بہن نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کی ایک سہیلی نستاسیا پیتروفن یہیں کہیں رہتی ہے۔شاید وہ اس بچہ کو قیام وطعام کے اخراجات کی ادائیگی کی شرط پر اپنے یہاں ٹھہرانے کے لئے آمادہ ہو جائے"

اس نے اپنی پاکٹ بک کے ورق الٹ پلٹ کر ایک ملا دلا پرچہ نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

نکل لوئر سٹریٹ۔نستاسیا پیتروفن تسکنوف

خود اپنے مکان میں رہتی ہے۔

پھر کہنے لگا۔ ہمیں فوراً چل کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیا مصیبت ہے۔"

ناشتہ کے فوراً بعد ایوان ایوپخ اور اگیورشکا سرائے سے نکل کھڑے ہوئے۔

"کیا مصیبت ہے۔" اس کے ماموں جان بڑبڑا رہے تھے۔

"تم تو میری چھاتی کا پتھر بن گئے ہو۔ تم اور تمہاری ماں پہ سنک سوار ہے کہ کسی طرح تمہاری اعلیٰ تربیت ہو جائے۔ تم دونوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

جب انہوں نے احاطہ کو پار کیا ہے تو گاڑیاں اور گاڑی بان وہاں نہیں تھے وہ سب کے سب صبح سویرے ہی گھاٹ کی طرف نکل گئے تھے۔ احاطہ کے ایک الگ تھلگ گوشے میں ٹم ٹم کھڑی تھی۔

"ٹم ٹم، ہم جا رہے ہیں۔" ایگورشکا نے دل ہی دل میں کہا۔

پہلے تو انہیں ایک وسیع دکشادہ سڑک سے ہوتے ہوئے سیدھا ئی چڑھ کر جانا تھا پھر انہیں ایک بڑے بازار سے گزرنا تھا یہاں پہنچ کر ایوان ایوپخ نے ایک پولیس والے سے لٹل لوئر سٹریٹ کا پتہ پوچھا۔

پولیس والا ہنس کر بولا "ابھی تو وہ بہت آگے ہے۔ اس چراگاہ کے پرے جاکر وہ جگہ آپ کو ملے گی۔"

رستے میں کئی اکے ملے۔ لیکن ایوان ایوپخ اکہ کرنے کا تکلف بہت خاص موقعوں ہی پر کرتے تھے مثلاً کسی تیوہار کسی میلہ کے موقعہ پر۔ سو اگیورشکا اور وہ دونوں نے دور تک پیدل مارچ کیا۔ دور تک ہموار سڑکوں پر چلتے چلے گئے۔ پھر ان گلیوں سے گزرے جہاں کوئی کھرنجا بندی نہیں ہوئی تھی بس دائیں بائیں چوبی تختے تھے اور آخر میں ایسی گلیاں آئیں جن میں نہ کھرنجا تھا نہ چوبی تختے تھے۔ جب چلتے چلتے اور پوچھتے گچھتے وہ لٹل لوئر سٹریٹ میں پہنچے تو ان دونوں کے منہ سرخ انگارہ ہو رہے تھے انہوں نے سر سے ہیٹ اتار لئے تھے اور پسینہ پونچھ رہے تھے۔

ایک بوڑھا آدمی ایک دروازے کے برابر بنچ پہ بیٹھا تھا۔ ایوان ایوونچ نے اس سے پوچھا
"بڑے میاں، ذرا آپ بتائیں گے کہ نستاسیا پیتروفنا تشکنوف کا مکان یہاں کہاں ہے۔"
بڑے میاں نے تھوڑا سوچ کر کہا کہ "یہاں تشکنوف نام کی تو کوئی بی بی نہیں رہتی تمتشکو کو تو تم نہیں پوچھ رہے؟"
"نہیں نہیں۔ اس بی بی کا نام تشکنوف ہے۔"
"معاف کیجئے۔ یاں پہ تشکنوف کسی کا نام نہیں ہے۔"
ایوان ایوونچ نے کندھے جھکائے اور آگے بڑھ گئے۔
بڑے میاں پیچھے سے پکارے "ڈھونڈھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بھائی میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اس نام کی کوئی بی بی یہاں نہیں رہتی۔"
"بڑی بی ذرا سنئے۔" ایوان ایوونچ نے ایک بوڑھی عورت کو مخاطب کیا جو ایک نکڑ پہ ناشپاتیوں اور سورج مکھیوں کے بیجوں کی چھابڑی لگائے بیٹھی تھی "نستاسیا پیتروفنا تشکنوف کا گھر یہاں کس طرف ہے۔"
بوڑھیا نے ایوان ایوونچ کو حیران ہو کر دیکھا اور ہنسی "نستاسیا پیتروفنا یہاں کیوں رہنے لگی۔ وہ اب اپنے مکان میں رہتی ہے۔" پھر چہک کر بولی "آٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ اس نے بیٹی کا بیاہ کیا اور مکان اپنا داماد کو دے دیا۔ تو اب تو اس کا داماد یہاں رہتا ہے۔" اور اس نے ایسے آنکھیں چلائیں جیسے کہہ رہی ہو کہ بیوقوف تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں ہے۔
"اور اب وہ بی بی کہاں رہتی ہے۔" ایوان ایوونچ نے سوال کیا۔
"خدا وندا۔" بوڑھیا نے حیران ہو کر اپنے ہاتھ چلائے اور بولی "وہ تو یاں سے آٹھ برس ہوئے چلی گئی۔ اب سے آٹھ برس پہلے اس نے اپنا مکان داماد کے حوالے کر دیا تھا۔"
غالباً وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ایوان ایوونچ کو بھی اس پر تعجب ہوگا۔ یہ شخص حیران ہو کر کہے گا "کیا کہہ رہی ہو، بڑی بی۔" مگر ایوان ایوونچ نے ایسا کوئی کلمہ نہیں کہا۔ بہت سکون سے

پوچھا "اب وہ بی بی کہاں رہتی ہے۔"

بوڑھیا نے آستین اکسا کر اپنا برہنہ بازو اٹھایا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز آواز میں چلاتے ہوئے کہا "سیدھے چلے جاؤ۔ سیدھے۔ بالکل سیدھ میں۔ ایک چھوٹا سا گھر آئے گا۔ پھر تمہارے الٹے ہاتھ پر ایک چھوٹی سی گلی آئے گی۔ اس چھوٹی سی گلی میں مڑ جاؤ۔ وہاں سیدھے ہاتھ پر تیسرا دروازہ ہے اس کا۔"

ایوان ایویچ اور ایگورنشکا چلتے چلتے اس چھوٹے سے سرخ مکان کے پاس پہنچے۔ الٹے ہاتھ کو ایک چھوٹی سی گلی میں مڑ گئے اور پھر سیدھے ہاتھ پر تیسرے گیٹ کو تلاش کرنے لگے خستہ و کہنہ مٹیالے رنگ کے دروازوں کے دونوں طرف مٹیلے رنگ کی کلڑی کی باڑھ کھنچی ہوئی تھی۔ باڑھ کا سیدھی طرف والا آدھا حصہ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس کے بالکل ہی گر پڑنے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ الٹے ہاتھ والی باڑھ پیچھے کو احاطہ کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ دروازے سیدھے کھڑے تھے جیسے ڈانوا ڈول ہوں کہ پیچھے کی طرف گریں یا آگے کی طرف ڈھے جائیں، یہ کہ سہولت کس طرف گرنے میں رہے گی۔ ایوان ایویچ نے کنڈی کھولی اور ایگورنشکا اور وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ کیا دیکھا کہ ایک بڑا سا احاطہ ہے جس میں لمبی لمبی گھاس اور نشان والے پتھر کھڑے ہوئے ہیں۔ دروازوں سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گھر نظر آرہا تھا جس کی چھت سرخ رنگ کی تھی اور کھڑکیوں کے پٹ ہرے رنگ کے تھے۔ ایک دوہرے بدن کی عورت اس انداز سے بیچ احاطہ میں کھڑی تھی کہ اس کی آستینیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں، دامن کا ایک کونہ ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے زمین پر کچھ بکھیر رہی تھی اور چھالڑی والی بوڑھیا کی سی تیز آواز میں پکار رہی تھی "چک۔ چک۔ چک"

اس کے عقب میں ایک کتھئی رنگ کا کتا کان کھڑے کئے بیٹھا تھا۔ نو واردوں کو دیکھ کر وہ دروازوں کی سمت میں لپکا اور اونچے سر میں بھونکنے لگا (کتھئی رنگ کے سب ہی کتے ہمیشہ اونچے سروں میں بھونکتے ہیں)۔

عورت نے ہاتھوں سے آنکھوں پر اس طرح سایہ کیا کہ ان پر دھوپ کی چمک نہ پڑے۔ چلا کر بولی "کیا چاہتے ہو۔"

"آداب عرض" الیوان الیوچ نے بھی اسی طرح اونچی آواز میں کہا ساتھ ہی اپنی چھڑی سے کتھئی رنگ والے کتے کو بھگانے کی کوشش کی "مہربانی فرماکر یہ بتائیے کہ کیا انستاسیا پیتروفن نشکنوف یہیں رہتی ہیں۔"

"ہاں یہیں رہتی ہیں۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو۔"

الیوان الیوچ اور ایگور نشکا چل کر اس کے پاس پہنچے۔ اس نے انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھا اور پھر اپنی بات دہرائی "تم لوگوں کو اس سے کیا کام ہے۔"

"شاید آپ ہی انستاسیا پیتروفن ہیں۔"

"ہاں ہوں۔ پھر؟"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی . . . . . دیکھئے آپ کی ایک پرانی سہیلی اورلگا افنوفن کیا سیف نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔ یہ اس کا بیٹا ہے۔ اور میں شاید آپ کو یاد ہو۔ اس کا بھائی الیوان الیوچ ہوں . . . . . آپ بھی آخر ہم این دالوں ہی میں سے ہیں۔ وہیں پیدا ہوئیں وہیں آپ کا بیاہ ہوا۔"

خاموشی چھا گئی۔ وہ فربہ عورت خالی خالی نظروں سے الیوان الیوچ کو تکنے لگی۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو یا اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔ پھر ایک ساتھ کھل اٹھی۔ اپنے دونوں ہاتھ چلائے۔ جوار اس کے دامن سے گر کر زمین پہ بکھر گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

"اورلگا افنوفن" تڑپ کر کلکاری ماری۔ خوشی کے مارے اس کا سانس نہیں سما رہا تھا

"ارے یہ تو میرا اپنا لال ہے۔ ارے میں اس طرح بیوقوفوں کی طرح کیوں کھڑی ہوں۔ ارے میرے پیارے ننھے فرشتے" اس نے بڑھ کر ایگورنشکا کو سینے سے لگا یا اس کے سارے چہرے کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دیا اور پھر سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔

" میرے خداوند"، ہاتھ مل مل کر کہنے لگی

" یہ اولگا کا لال ہے۔ کیسا پیارا بچہ۔ بنا بنایا ماں ہے ۔ وہی ماں والی شکل و شباہت۔ لیکن آپ لوگ یہاں احاطہ میں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلئے۔"

سانس چڑھا ہوا، اپنے آپ سے باتیں کرتی، چیختی نعرے مارتی لپک جھپک گھر میں گھس گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے مہمان ہو لئے۔

اس نے مہمانوں کو ایک چھوٹے سے گھٹ کمرے میں لا کر بٹھایا جس میں چاروں طرف شبیہیں سجی تھیں۔ گلدان آراستہ تھے۔ کہنے لگی " ابھی تک کمرے کی جھاڑ پونچھ بھی نہیں ہوئی ہے واسیلیسا، ادوا سیلیسا، ذرا کھڑکیاں تو کھول دے ننھے میاں، پیارے میاں۔ ارے مجھے کیا پتہ تھا کہ اولگا کا ایک اچھا سا بیٹا بھی ہے۔"

جب اسے ذرا قرار آیا اور اس نے اپنی حیرت و مسرت پہ تھوڑا قابو پایا تو ایوان الویچ نے کہا کہ مجھے آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔ ایگور شکا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کپڑے سینے کی ایک مشین رکھی تھی۔ کھڑکی میں ایک پنجرہ رکھا تھا جس میں مینا بیٹھی تھی اور شبیہیں اور گلدان اتنے ہی جتنے ڈرائنگ روم میں تھے۔ مشین کے برابر ایک ننھی سی لڑکی کھڑی تھی۔ سانولی رنگت، پھولے پھولے گال، صاف ستھرے سوتی کپڑے پہنے ہوئے ایگور شکا کو تکنے لگی۔ ذرا جو آنکھ جھپکی ہو کچھ سٹپٹائی ہوئی نظر آتی تھی ایگور شکا نے اسے دیکھا۔ تھوڑا رکا پھر پوچھا " تمہارا نام کیا ہے۔"

" انکار"

اس کا مطلب تھا کا تکا

" وہ آپ کے پاس رہے گا" ایوان الویچ نے دوسرے کمرے میں ایک سرگوشی میں اس خاتون سے کہا۔ اگر آپ اس تجویز کو قبول کر لیں تو آپ کی بہت عنایت ہوگی۔ ہم اس کے اخراجات کے لئے دس روبل ماہوار آپ کی نذر کیا کریں گے۔ شریر بچہ نہیں ہے۔ بہت سیدھا

اور خاموش بیٹھے ہیں"۔

"ایوان ایلوپخ صاحب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہوں"۔ نستاسیا نے آبدیدہ ہو کر کہا "دس ربل ماہوار کی پیش کش تو بہت اچھی ہے۔ مگر کسی دوسرے کے بچہ کو اپنے پاس رکھنے میں پریشانی بہت ہوتی ہے۔ بیمار پڑ جائے یا کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے"۔

ایگورشکا کو واپس ڈرائنگ روم میں بلایا گیا۔ ایوان ایلوپخ ہاتھ میں ہیٹ لئے کھڑے تھے۔ اور الوداع کہہ رہے تھے۔

"تو اب یہ بچہ آپ کے پاس رہے گا۔ تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ ایگور تم یہیں رہو گے"۔ انہوں نے بھانجے کو مخاطب کر کے کہا "دیکھو انہیں پریشان مت کرنا۔ ان کا کہنا ماننا .... اچھا سلام۔ کل میں پھر آؤں گا"۔

اور ایوان ایلوپخ چلے گئے۔ نستاسیا نے ایک دفعہ پھر ایگورشکا کو سینہ سے چمٹایا۔ ننھا فرشتہ کہہ کر اسے پکارا اور پھر رات کا کھانا پکانا شروع کر دیا۔ اس کیفیت کے ساتھ کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں اور تین منٹ بعد کیا دیکھتے ہیں کہ ایگورشکا اس کی بغل میں بیٹھا اس کے لگاتار سوالوں کے جواب دیتا چلا جا رہا ہے اور مزے دار کرم کلّہ کا سوپ بھی پیتا جا رہا ہے۔

شام کو پھر وہ اسی میز پر آکر بیٹھا اور ہاتھ پہ سر ٹکا کر نستاسیا کی باتیں دھیان سے سننے لگا۔ اس بی بی نے اس عالم میں کہ کبھی ہنسنے لگتی کبھی رو پڑتی اسے کیا کیا قصے سنا ڈالے، اس کی ماں کی جوانی کے دنوں کی باتیں، اپنے بیاہ کی باتیں، اپنے بچوں کی باتیں۔ سٹوو کے قریب ایک جھینگر چیں چیں کرنے لگا۔ اور لیمپ کی بتی سے ہلکی سنسناہٹ سی پیدا ہونے لگی۔ وہ بی بی اپنی دھیمی آواز میں اسی طرح بولے جا رہی تھی۔ بار بار جوش جذبات میں انگلی سے چھلا اتار دیتی۔ بار بار اس کی پوتی کاتکا میز کے اندر سٹک جاتی اور دیر تک اندر گھسی رہتی شاید ایگورشکا کے پیروں کے جائزے کی نیت سے ایگورشکا بیٹھا سنے جا رہا تھا اس عالم میں کہ سوچ میں ڈوبا ہوا

تھا اور اس کی نظریں اس بوڑھی بی بی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے منے پر اس کے بالوں پر، اس کے آنسوؤں سے بھیگے رخساروں پر۔ وہ اداس ہو گیا، بہت اداس۔ ایک پیٹی کے اوپر اس کا بستر بچھا دیا گیا اور اسے بتا دیا گیا کہ اگر رات بے رات اسے بھوک لگ آئے تو وہ خود اٹھ کر باہر گیلری میں چلا جائے وہاں کھڑکی میں پلیٹ میں کچھ ڈھکا رکھا ہوگا۔ اس میں سے تھوڑا مرغی کا سالن نکال کر کھا لے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ایوان ایونچ اور پادری کرسٹفر الوداعی ملاقات کے لئے آن پہنچے نستاسیا تیرفن انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ وہ ان کی خاطر سموار اٹھا کر لانے لگی تھی لیکن ایوان ایونچ بہت عجلت میں تھے۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگے "پھر کسی وقت اگر آپ کے ساتھ چائے پانی پئیں گے۔ اس وقت تو ہم پا بہ رکاب ہیں۔"

الوداع کہنے سے پہلے وہ سب بیٹھ گئے تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے۔ نستاسیا تیرفن نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور ڈبڈبائی آنکھوں سے شبیہہ کو تکنے لگی۔

"اچھا"، ایوان ایونچ اٹھتے ہوئے بولے "تو تم یہاں رہو گے......" ان کے چہرے سے وہ خشکی وہ کاروباری پن غائب ہو گیا تھا۔ تھوڑا اٹک کر، تھوڑا اداسی سے مسکراتے ہوئے کہنے لگے "اچھا، پڑھائی پہ دھیان دو۔ خوب محنت سے پڑھو......ماں کو مت بھول جانا۔ نستاسیا تیرفن کا کہنا ماننا۔ ایگور اگر تم نے سعادت مندی دکھائی اور محنت سے پڑھائی کی تو میں تمہیں بے آسرا نہیں چھوڑوں گا۔"

جیب سے اپنا بٹوہ نکالا، ایگور شکا کی طرف پیٹھ کر کے دیر تک ریزگاری میں کچھ ٹٹولتے رہے۔ پھر دس کوپک والا ایک سکہ نکال کر ایگور شکا کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ پادری کرسٹفر نے ایک آہ کھینچی اور روتے ہوئے ایگور شکا کو دعا دینے لگے "باپ کا واسطہ، بیٹے کا واسطہ، روح القدس کا واسطہ......بچے دل لگا کر پڑھو۔ خوب محنت کرو......اگر ہم دنیا سے کوچ کر جائیں تو ہمارے لئے دعا کے دو کلمے پڑھ دینا۔ اور یہ لو۔ یہ ہماری طرف سے ہے۔" پادری صاحب نے

بھی دس کوپک کا ایک سکہ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

ایگور شکا نے پادری صاحب کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ بوسہ دیتے دیتے اس کا دل بھر آیا۔ شاید کسی غیبی طاقت نے اس کے کان میں پھونک دیا کہ اس کے بعد وہ اس بزرگ کو نہیں دیکھ پائے گا۔

"نستاسیا تیتروفنا، میں نے جمنیزیم میں درخواست دی دی ہے۔" ایوان ایوچ نے یہ بات ایسے لہجہ میں کہی جیسے کمرے میں کوئی لاش رکھی ہو۔ "آپ اسے ۷ اگست کو امتحان دلانے کے لئے لے جائیں۔ ..... اچھا سلام رخصت۔ اچھا ایگوری، تمہیں خداوند کی امان میں دیا۔ خوش رہو۔ ہم چلے۔"

نستاسیا تیتروفنا نے ایک سسکی بھری منہ بسور کر بولی "چائے تو پی لیتے۔"

ایگور شکا کی آنکھوں میں تو آنسو ڈبڈبا رہے تھے وہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ ماموں جان اور پادری صاحب کب کمرے سے نکل گئے۔ جب وہ دوڑ کر کھڑکی پہ پہنچا تو وہ احاطہ سے نکل کر جا بھی چکے تھے اور کتھئی رنگ والا کتا گیٹ سے دوڑتا ہوا اس شان سے واپس آ رہا تھا جیسے کسی اجنبی پہ بھونکنے کا فریضہ ادا کر کے لوٹ رہا ہو۔ ایگور شکا نہ جانے کیا سوچ کر کھڑکی سے پلٹا اور کمرے سے نکل کر دوڑ پڑا۔ جب وہ گیٹ پہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ماموں جان اپنی خمیدہ چھڑی گھماتے ہوئے اور پادری صاحب اپنا عصا پٹختے ہوئے موڑ مڑ رہے ہیں اور نظروں سے اوجھل ہونے لگے ہیں ان دونوں بزرگوں کے چلے جانے سے ایگور شکا کو ایسا لگا کہ جیسے وہ سادہ زمانہ بھی جو اس نے اب تک بسر کیا تھا ان کے ساتھ ہی چلا گیا، دھوئیں کی مانند، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ کس بے چارگی کے ساتھ وہ گھر کی طرف پلٹا۔ ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کے ساتھ وہ اس نئی انجانی زندگی کا استقبال کر رہا تھا۔ جو اب اس کے تئیں شروع ہونے لگی تھی ..... جانے کیسی ہو یہ زندگی۔

Rs. 600.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-1877-2
ISBN-13: 978-969-35-1877-1